خواجہ حسن نظامی

فہرست

1۔ مقدمہ — عائشہ احمد عاشی — 7

2۔ تمہید — 33

3۔ شہزادہ خانساماں — 35

4۔ مرزا مغل کی بیٹی — 42

5۔ نرگس نظر کی مصیبت — 48

6۔ غدر کی زچہ — 56

7۔ کفنی — 63

8۔ دکھیا شہزادی کی کہانی — 71

9۔ فاقہ میں روزہ — 76

10۔ بیچاری شہزادی کا خاکی چھپر کھٹ — 83

11۔ شہزادے کا بازار میں گھسیٹنا — 87

12۔ شہزادی کی چتا — 92

13۔ بھکاری شہزادہ — 95

14۔ یتیم شہزادہ کی عید — 98

15۔ جب میں شہزادہ تھا — 104

16۔ جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا — 111

17۔ غمگین شہزادی — 114

18۔ یتیم شہزادے کی ٹھوکریں — 123

19۔ بنت بہادر شاہ — 127

مقدمہ

خواجہ حسن نظامی کا اصل نام "سید علی حسن عرف حسن نظامی تھا۔ علامہ اقبال نے خواجہ حسن نظامی لکھنا شروع کیا۔ مصور فطرت، امام المشائخ عوامی خطابات ہیں۔ جنوری 1946ء میں حکومت کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔

آپ کی تاریخ پیدائش 2 محرم 1296ھ بمطابق 80-1879ء بستی حضرت نظام الدین اولیاء دہلی میں ولادت ہوئی۔ والد کا نام حافظ سید عاشق علی نظامی اور والدہ کا نام چھتی بیگم تھا۔ آپ گیارہ سال کے تھے کہ ماں باپ دونوں ایک سال کے اندر انتقال کر گئے اور بڑے بھائی سید حسن علی شاہ نے اُن کی سرپرستی لی۔

خواجہ صاحب کے اجداد مہاراجہ پرتھوری راج چوہان کے زمانے میں بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اور قدیم تاریخوں اور تذکروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو مہاراجہ کے دربار میں اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ایک بزرگ خواجہ سید بدرالدین بہت بڑے عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ اُن کی شادی حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر کی صاحبزادی فاطمہ بی بی سے ہوئی اور بابا صاحب نے اُن کو خلعت بھی دی۔ حضرت نظام الدین اجودین اور موجودہ پاک پٹن ضلع ساہیوال پاکستان گئے تھے تو خواجہ بدرالدین الحق کے پاس ٹھہرے۔ دونوں میں ایسا تعلق تھا کہ حضرت بابا صاحب اور حضرت بدرالدین اسحاق کا وصال ہو گیا تو حضرت نظام اولیاء نے اُن کے دونوں کمسن لڑکوں خواجہ سید محمد امام اور خواجہ سید موسیٰ کو اپنے پاس دہلی بلا لیا اور اولاد کی طرح پالا اور اُنہیں ایسی خلافت عطا کی کہ لوگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید ہونے آئے تو وہ اُنہیں خواجہ سید محمد امام نظامی کا مرید ہونے کا حکم دیتے۔ اپنی مجلس میں سب سے اُوپر بٹھاتے اور باہر کی دعوتوں میں اپنا قائم مقام بنا کر بھیجتے اور نماز میں اُن کو امام بناتے۔ خواجہ سید محمد امام نظامی کی اولاد کی شادیاں حضرت نظام الدین اولیاء کی بہن کی اولاد سے ہوئیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی اُنہی خواجہ سید محمد امام کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین سے متعلق چار خاندانوں میں فریق

اول بنیرگان کہلاتا ہے۔ خواجہ صاحب کا شجرہ نسب یہ ہے:

(1) حضرت علی مرتضیٰ (2) حضرت امام حسین (3) حضرت زین العابدین (4) حضرت سید عمر اشرف (5) حضرت سید زکریا اصغر محدث شاہ (6) حضرت سید قطب الدین عمر شجری (7) حضرت ابو عبداللہ (8) حضرت سید علی صدر الدین (9) حضرت سید حسن جلال الدین (10) حضرت سید احمد فتح اللہ (11) حضرت سید محمد (12) حضرت سید احمد (13) حضرت سید محمد (14) حضرت سید محمود (15) حضرت سید احمد (16) حضرت سید مہناج (17) حضرت سید اسحاق (18) حضرت خواجہ سید علی لالہ (19) حضرت مولانا سید بدر الدین اسحاقؒ (20) حضرت خواجہ سید محمد امام نظامی (21) حضرت خواجہ سید داؤد نظامی (22) حضرت خواجہ سید علیم الدین نظامی (23) حضرت خواجہ سید حسن نظامی (24) حضرت خواجہ سید مبارک نظامی (25) حضرت خواجہ سید جلال الدین نظامی (26) حضرت خواجہ سید ایوب نظامی (27) حضرت خواجہ سید عبداللہ نظامی (28) حضرت خواجہ سید عبداللہ نظامی (29) حضرت آغا سید فضل علی نظامی (30) حضرت حافظ سید عاشق علی نظامی (31) حضرت سید خواجہ حسن نظامی (32) حضرت حافظ سید عاشق علی نظامی (33) حضرت خواجہ حسن نظامی۔

ابتدائی تعلیم بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں حضرت مولانا اسماعیل کاندھلویؒ حضرت مولانا محمد میاں کاندھلویؒ اور حضرت مولانا محمد یحییٰؒ اور والد ماجد حضرت مولانا زکریاؒ شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سے حاصل کی۔ صرف ایک دن کیلئے انگریزی سکول میں گئے۔ دہلی میں مولوی وصیت علی صاحب مرحوم مولوی حکیم الدین پنجابی اور مولوی حکیم رضی الحسن کاندھلوی سے بھی پڑھا اور آخر میں حضرت مولانا محمد یحییٰؒ خواجہ صاحب کو حضرت مولانا رشید کے مدرسے میں گنگوہ لے گئے اور وہاں اُنہوں نے ڈیڑھ سال تک تعلیم حاصل کی۔

گنگوہ سے واپسی پر اُٹھارہ سال کی عمر میں خواجہ صاحب کی پہلی شادی اُن کے چچا سید معشوق کی لڑکی سیدہ حبیب بانو سے ہوئی۔ چند سال بعد رمضان 1330ھ میں پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا۔

گیارہ سال کی عمر میں خواجہ صاحب کو اُن کے والد محترم نے حضرت شاہ اللہ بخش صاحب تونسوی کا مرید کروادیا تھا مگر اُن کا جلد ہی وصال ہوگیا۔ اس کے بعد بڑے بھائی نے پنجابی زبان کے مشہور بزرگ شاعر حضرت خواجہ غلام فرید صاحب سے بیعت کروادیا مگر اُنہوں نے بھی رحلت

فرمائی اور چوبیس سال کی عمر میں خود اپنے ارادے اور حضرت بابا فریدؒ کے روحانی اشارے کی بناء پر خواجہ صاحب نے حضرت پیر مہر علی شاہ چشتی نظامی سجادہ نشین خانقاہ گولڑہ شریف ضلع راولپنڈی سے بیعت کی اور خلافت پائی۔ 6-1905ء میں اپنے نومسلم عربی غلام نظام الدین صاحب خاکسار کے شوق دلانے پر سادھوؤں کے لباس میں تمام ہندو تیرتھوں کی یاترا کی اور فلسفہ ویدانت سیکھا۔ اپنا سفرنامہ ''تیرتھ یاترا'' کے نام سے لکھا جس کے چھپنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کفر کا فتویٰ لگ گیا۔ پہلا مضمون ''انڈیا کی نازک حالت'' کے عنوان سے ''انڈیا گزٹ'' بمبئی میں لکھا۔ پھر پیسہ اخبار لاہور، وکیل امرتسر، سر عبدالقادر کے مخزن اور راولپنڈی بہاالدین کے رسالے صوفی وغیرہ میں لگا تار لکھتے رہے۔ پہلی کتاب ''مفلسی کا مجرب علاج'' لکھی۔ 1908ء میں درگاہوں اور خانقاہوں کی اصلاح اور تعلیمات تصوف کی ترویج و اشاعت کیلئے حلقہ نظام المشائخ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس حلقے کے مولانا آزادؒ، شبلی نعمانیؒ، پھلواری جیسے بہت سے مشاہیر ممبر تھے۔ 1909ء میں حلقہ نظام الدین المشائخ کے کارکن کی حیثیت سے ملا واحدی کی شرکت میں رسالہ ''نظام المشائخ'' جاری کیا۔ حلقہ نظام المشائخ کے مقاصد کی اشاعت کیلئے 1911ء میں مصر کا سفر کیا اور سفر کے دوران مولوی برکت اللہ وغیرہ انقلابیوں سے بھی ملے اور خفیہ رپورٹوں کی بناء پر سفر سے واپسی پر مسلسل چھ برس تک پولیس کی نگرانی رہی اور متعدد بار حراست میں لیا گیا۔ 1913ء میں میرٹھ سے اخبار ''توحید'' جاری کیا۔ اُس زمانے میں کان پور کی مسجد کا ہنگامہ ہوا اور خواجہ صاحب نے میرٹھ کی جامع مسجد میں ''کوہ تکبیر'' کے عنوان سے انگریز کے خلاف ایک تقریر کی۔ اس تقریر کی اشاعت پر اخبار ''توحید'' ضبط کر لیا گیا۔

1916ء میں سیدہ محمودہ خواجہ بانو سے خواجہ صاحب کی دوسری شادی ہوئی۔ دوسری شادی کے بعد خواجہ صاحب نے کتابیں لکھنے کی طرف توجہ کی اور چھوٹی بڑی کئی سو کتابیں اور رسالے تصنیف و تالیف کیے۔ متعدد روزانہ، دو وقت، سہ روزہ، ہفتہ روزے اور ماہانہ اخبار و رسالے جاری کیے۔ رسالہ منادی 1926ء سے چھپنا شروع ہوا۔ سب سے طویل مدت تک خواجہ صاحب نے اس رسالے کو ایڈیٹ کیا۔

10 ذی الحجہ 1374ھ کا دن گزرنے کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان رحلت فرمائی۔ عیسوی تاریخ 31 جولائی 1955ء اتوار اور پیر کی درمیانی شب تھی۔ قبر اُنہوں نے پچاس برس پہلے ہی بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دہلی میں تیار کرا رکھی تھی اُسی میں دفن ہوئے۔

اُردو اکادمی دہلی نے مشاہیر دہلی پر سیمیناروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس کی ابتداء شمس العلماء' مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی سے ہوئی۔ یہ ایک انتہائی درست قدم تھا۔ اُن کو مہکِ اُردو کہنا غلط نہ ہوگا۔ "اُردو ادب" آج بھی اُن کی تحریر میں رچا بسا نظر آتا ہے۔

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی بڑی جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ ہر پہلو میں نیا انداز جلوہ لئے ہوئے اُنہیں صوفی' معلم' مصلح' ادیب' مقرر' تاجر غرض ہر روپ میں اِک جداگانہ انداز' اتنی جامع صفات شاید کسی ایک ذات میں موجود نہ ہوں لیکن خواجہ صاحب کے ہاں یہ خوبیاں نہ صرف موجود تھیں بلکہ اُن کے ہر انداز اور صفت میں اُن کو عزت و وقار بھی ملا۔

خواجہ صاحب کے ہاں ایسا کتابی علم بھی تھا جو کتابوں کا محتاج نہ تھا بلکہ بزرگوں کی صحبت سے ملا۔ بقول علامہ اقبال: "نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں" اُن کی آنکھ کی روشنی نے اُن کے دماغ کو منور کیا اور پھر قلم کے راستے علم کی راہیں نہ صرف روشن کیں بلکہ اُنہیں زندہ و جاوید کر دیا۔ ملا واحدی دہلوی نے لکھا ہے کہ "میں خواجہ صاحب کے ساتھ روز سیر کرنے جاتا تھا۔ واپسی پر سیر کے مشاہدات کی مدد سے خواجہ صاحب بے شمار مضامین تیار کر لیا کرتے تھے اور میں سوچتا ہی رہ جاتا تھا۔ "دیکھی تو میں نے بھی تھی لیکن مجھے دھیان نہ رہا۔ میرے اندر وہ خوبی پروان نہ چڑھی جو اُن کے اندر رچ بس گئی تھی" ایک بار اپنے بڑے بیٹے حسین نظامی سے جو انگریزی ادب پر عبور رکھتے تھے' فرمایا کہ بیٹا! تم نے انگریزی پڑھی ہے اور تمہارے باپ نے انگریز کو پڑھا ہے اور اُنہوں نے انگریز کے ساتھ ساتھ قدرت کی چھوٹی بڑی سب اشیاء کو پڑھا۔ اُنہوں نے گھاس کے تنکے' مکھی' مچھر' اُلّو سے لے کر اعلیٰ موضوعات کو بھی اپنے مطالعے میں شامل کیا اور اُن کے مطالعے کے نتائج سب کے سامنے رکھے۔ وہ اُردو ادب کے صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ دہلی کے غدر 1857ء کی نسبت بارہ حصوں میں تاریخی واقعات لکھے جس میں پہلا حصہ "بیگمات کے آنسو" کو خاص شہرت ملی۔ شاہی خاندان کی بربادی کی ایک ایک کرن کو سمیٹ کر ایک نوحہ کی طرح سامنے رکھا ہے۔

خواجہ حسن نظامی اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر پیر کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ میری خصوصیت

محنت' حلال روزی اور زندگی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینا ہے۔ میرے جس مرید میں یہ خصوصیات پائی جائیں' وہ سمجھ لے کہ میرا سچا مرید ہے۔

خواجہ صاحب کسی کو بیکار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مدد کا انداز کچھ یوں تھا کہ ضرورت بے ضرورت محنت کراتے اور پھر حق سے زیادہ معاوضہ ادا کرتے۔ اُن کے نزدیک کسی ہٹے کٹے آدمی کی مدد کرنا قوم کو اپاہج بنانے کے مترادف تھا۔

تعلیمی میدان میں بھی اُن کی خدمات بے مثال ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کے علیحدہ علیحدہ سکول اور ہوسٹل بنانے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے اُردو لٹریچر تیار کرنا اور تعلیمی ضروریات کے تحت "سکول گزٹ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا اور دوسرا اخبار "عورتوں کا اخبار" بھی نکالا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی خواتین نئی تعلیم کی طرف رجوع کریں اور گھر اور باہر کی ضروریات سے آگاہ ہوں۔ اُن کے خیال میں قوم کا مستقبل اِس صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی جائے کیونکہ آنے والی نسل اِن بچیوں کی گود میں ہی پروان چڑھے گی۔ اگر ہماری بچیاں سنور گئیں تو آئندہ نسل اپنے آپ سنور جائے گی۔

خواجہ صاحب کے خیال کے مطابق تعلیمی نصاب اِس طرح تشکیل دیا جانا چاہیے کہ مقصد پڑھنا لکھنا ہی نہ ہو۔ مزید اُنہی کے الفاظ میں "بچیوں کو گھر اور باہر کی ہر ضرورت سے آگاہ کیا جائے اور حاکمانہ جذبہ انتظام اُن میں پیدا کیا جائے"......

اُنہوں نے سماج میں فضول رسموں کے خلاف بھی زبردست مہم چلائی تھی جس میں اُن کو کافی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اُنہوں نے جلسے جلوس اور دیگر دوسرے طریقے مثلاً مضامین' پوسٹر اور اشتہارات کے ذریعے بھی اِن غلط قسم کی رسومات کے خلاف جہاد کیا اور اُن کے یہ مضامین اور اشتہار اُردو زبان کے اسلامی لٹریچر کا اہم حصہ ہیں۔ رسموں کی مخالفت نہ صرف شادی بیاہ وغیرہ تک نہ کی بلکہ خانقاہوں اور درگاہوں کی غیر مفید رسوم بھی ترک کروا دیں۔

خواجہ صاحب نے تصوف کو اِس انداز میں پیش کیا کہ جس کو روزمرہ زندگی میں برتا اور اپنایا جا سکتا ہے اور زندگی میں راحت کا عنصر شامل کیا جا سکتا ہے۔

صوفی کے بیج توحید میں بوئے جاسکتے ہیں۔ توحید ہی اُس کو ایک درخت کی طرح پروان چڑھاتی ہے اور اُسے حرکت پر لے آتی ہے جہاں دوئی اور غیریت کی سب دیواریں گر جاتی ہیں۔ اسی کیفیت توحید نے ہماری مشترکہ اور گنگا جمنی تہذیب کو زندگی بخشی ہے۔ خواجہ صاحب نے اِس

روایت کو اپنے بزرگوں کی طرح پروان چڑھایا اور اُنہیں یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ اُنہوں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، شری کرشن اور گورو بابا نانک کی سوانح عمریاں بھی لکھیں اور ہر سوانح عمری میں جداگانہ عقیدت اور عشق کا انداز پیش کیا اور قلم کے ذریعے ملک اور قوم میں اتحاد پیدا کرنے کا ایک عظیم کام کیا۔ اُنہیں ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اُن کا ایک بہت بڑا کام ہندی اور اُردو زبانوں کو قریب تر کرنا ہے۔ خواجہ صاحب کی تحریر اگر فارسی رسم الخط میں چھپے تو وہ اُردو ہے اور اگر اُسے ناگری میں شائع کیا جائے تو وہ ہندی ہے۔ ہندی کے قاری کو خواجہ صاحب کی زبان پڑھنے یا سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی کیونکہ خواجہ صاحب کا ایک بڑا کام اُردو میں سادہ اور آسان نثر کو رواج دینا ہے۔ مضامین میں اُنہوں نے عام فہم زبان استعمال کی۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

''آج کل اپنی جہالت چھپانے یا اپنی علمیت جتانے کیلئے خوامخواہ لوگ عربی فارسی ترکیبوں اور مشکل اور دقیق الفاظ کا بوجھ بیچاری اُردو کی گردن پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ اِس کی متحمل نہیں ہوتی۔ یہ اُردو کی ترقی نہیں تنزل ہے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اُردو سب میں مقبول ہو۔ مگر اِن تحریروں سے وہ مردود ہوتی ہے۔ جو فصاحت سادگی میں ہے، وہ اِن پیچیدہ اور مغلق تحریروں میں کہاں۔ یہ گُر کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے''......

اگر یہ کہا جائے کہ خواجہ حسن نظامی اُردو نثر کے نظیر اکبرآبادی تھے کیونکہ وہ روزمرہ زندگی کی سیدھی سادی اور عام سی چیزوں کو عزت اور وقار بخشنے والے عوام کے درمیان میں رہنے اور اُن کے دکھ سکھ بانٹنے والے اور روزمرہ زندگی کی سچی تصویر میں الفاظ میں ہی نہیں، باتوں باتوں میں کھینچنے والے، غرض اُردو کی جمہوریت میں نظیر اکبرآبادی کے بعد خواجہ صاحب نے ہی خواجگی کا سکہ چلایا۔

ایک جگہ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

''اِس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں اُن کو چار چاند لگا کر چمکا دوں گا''...... (جھینگر کا جنازہ)

ایک اور مضمون میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''میں دمڑی کا آدمی ہوں۔ سوئیاں سستی تھیں تو اپنی گُدڑی میں آسانی سے پیوند لگا لیتا تھا۔ اب یہ دونوں یعنی سوئیاں اور رنگ، اِس قدر گراں ہیں کہ میں نہ

سوئیاں خرید سکتا ہوں نہ رنگ۔ یونہی میلے کچیلے چیتھڑے لگائے پھرتا ہوں...... میں تو روکھی روٹی بھر کر اور کنوئیں کا پانی اور تن کا موٹا جھوٹا کپڑا چاہتا ہوں''...... (کم اِن مائی ڈیر سے اقتباس)

اِن عبارتوں میں آسمان کیسا چمکیلا اور دھوپ کیسی چٹکیلی لگنے لگتی ہے اور عام سے عام چیز بھی اپنے پرت کھولنے لگتی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کے پاس بے شمار سہارے تھے کیونکہ ہر شاعر کے پاس قافیے کی جھنکار، ردیف کا چٹخارا اور شعری اسلوب کے بہت سے پینترے ہوتے ہیں اور خواجہ صاحب نے یہ سارا انداز و رنگ نثر میں شامل کر دیا۔ نہ قافیہ نہ ردیف نہ بحر نہ وزن نہ تشبیہ کا جادو، نہ استعارے کی بیساکھی اور سیدھی سادی نثر میں یوں لکھتے چلے گئے جیسے وہ اِن سب سے بے نیاز ہوں اور یہ بے نیازی بڑی دشواری ہے۔ اِسی لئے کسی نے کہا ہے کہ: ''دشوار بست آساں زیستین'' خواجہ صاحب کے اِس آسان زیستین ہی میں اُن کے نثری اُسلوب کا راز پنہاں ہے۔ یہ درست ہے کہ اُسلوب محض شخصیت نہیں اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے مگر شخصیت میں شاید اُسلوب کی کلید تلاش کی جا سکتی ہے۔

قلم اور کاغذ ادب کے معاون بھی ہیں اور اِس کے دشمن بھی۔ جب لفظ قلم کے راستے کاغذ پر منتقل ہوتا ہے تو الفاظ کا رشتہ جیتی جاگتی گفتگو سے کٹ کر تحریر سے جڑنے لگتا ہے اور زبان کتابی ہونے لگتی ہے۔ لفظ وہی زندہ ہے جو گفتگو سے کٹ کر تحریر میں رچنے لگے۔ بات چیت سے بے تکلفی پیدا ہوتی ہے۔ لفظ لہجہ بنتا ہے۔ اشارہ کنایئے سے نت نئے رنگ نیرنگ بنتا ہے۔ قلم جب زبان کو خودرو پودے کی طرح بات چیت کا انداز نرمی اور گرمی سے اُبھرتا ہے۔ قلم جب اِن تحریروں کو اپنے رنگ میں رنگتا ہے تو گفتگو کے بھی انداز فنا ہو جاتے ہیں اور لفظوں کی تمام سیاہی کاغذ پر بکھر جاتی ہے۔ کہیں کہیں زندگی کی رمق ہوتی ہے گو کہ وہ زندگی کتابی ہوتی ہے۔ لفظ بول اور بات سے ہٹ کر تحریر بن جاتا ہے۔ تحریر کی اِس دیوار کو بہت کم مصنف فتح کر پاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک مصنف خواجہ صاحب ہیں۔

خواجہ صاحب فلسفہ ویدانت سے متاثر ہونے کے باوجود ویدانتوں کی طرح دنیا کو مایا جال نہیں جانتے تھے۔ شری کی فتوحات اور موت اور فنا کے زاویوں نے اُنہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ وہ اپنی گیان کتھا کچھ یوں سناتے ہیں:

"اپنے گیان دیس ہندوستان کو کیا کہوں۔ بدیسی سنگت سے گیانی ہو گیا ہے...... رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں نور و ظلمت سے حکومتیں پلٹ جاتی ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ تیرے صبر و قرار کیلئے سنسار بے قرار ہے۔ شعلے بھڑکتے ہیں۔ دریا بہتے ہیں۔ سمندر موجیں مارتا ہے۔ ہوا چلتی ہے۔ بادل آتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے۔ بوندیں اعلیٰ سے اسفل ہوتی ہیں تا کہ تیرا وجود انقلاب ایام سے گھبرا نہ جائے اور جانے کہ ہر گردش ہر موجود کی ڈیوٹی ہے۔ بدلنا ہر حالت کا اقتضا ہے...... پھانس نکلنے کو چبھتی ہے۔ پیاس بجھنے کو لگتی ہے۔ بھوک پیٹ بھرنے کیلئے پیدا ہوتی ہے۔ جب کانٹا چبھے تو سمجھ لے کہ اس کو ایک وقت نکلنا ہے۔ بھوک پیاس کی خواہش ہو تو خیال کر کہ کھانا پانی ملنا لازمی ہے۔ بیماری آئے تو یقین کر کہ تندرستی بھی اس کے ساتھ ہے...... انسان! آدمی! خیال کو جب ہر چیز اپنی غرض اور ذاتی مطلب کیلئے متحرک ہے تو تُو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ کرم کر...... عمل کو...... گیان موکش نجات سرور ابدی عمل و حرکت میں ہے"......(سی پارہ دل گیان کتھا)

اپنے اس قول پر خواجہ صاحب کا عمل بھی تھا۔ پیر ہونے کے باوجود نہ کبھی وہ گوشہ نشین ہو کر بیٹھے اور نہ کبھی مریدوں کی نذروں پر انحصار کیا۔ وہ کتابوں اور دواؤں کے کاروبار سے ہر روز اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے محنت کر کے روزی کا سامان پیدا کرتے رہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ایک دفعہ مذاق مذاق میں سچی بات کہہ دی:

صوفی بھی ہیں، درویش بھی ہیں اور ملنگ بھی
اور جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی

خواجہ صاحب کا شمار اعلیٰ ترین دلی والوں میں سے تھا جن کی زندگی اور اُن کے کام کا جائزہ لینا ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اُن کی پیدائش 2 محرم 1296ھ کو ہوئی اور وفات 31 جولائی 1955ء کو ہوئی۔ اب اُن کے اکثر دوست احباب بھی اللہ کو پیارے ہو چکے ہوں گے جو ذاتی تعلق اور دوستی کی بناء پر اُن کے بارے میں نئی باتیں بتا سکتے تھے اور قاری کو ایک نیا مواد پڑھنے کو ملتا یا یوں کہیے کہ اُن کی ذات کے چھپے ہوئے انداز ایک روشن باب کی طرح سامنے آتے۔

فورٹ ولیم کالج نے بہت بڑی تعداد میں کتابیں تیار کیں لیکن جو شہرت میر امن دہلوی کی

کتاب "باغ و بہار" کو ملی وہ کسی اور کتاب کو نصیب نہ ہوئی۔ اس کی مقبولیت کی وجہ کچھ یوں تھی کہ "بہ قول میر امن" اس قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان مرد، لڑکے بالے خاص و عام بولتے جاتے ہیں کیا ہے...... اس محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی بات کرتا ہے" میر امن دہلوی کی تصنیف "باغ و بہار" نثر نگاری کا دوسرا سنگ میل ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحریر کا تقریر سے قریب تر ہونا دہلوی نثر کی سب سے اعلیٰ و اہم خصوصیت قرار پائی۔

خواجہ حسن نظامی کی بات عوام اور خواص دونوں کیلئے ہیں۔ وہ اس بات سے آشنا ہیں کہ اپنا مخاطب اور قاری عوام کو بناؤ۔ اس طرح تمہاری بات خود بخود خواص کی سمجھ میں آجائے گی۔ خواجہ صاحب کی نثر گفتگو روزمرہ اور عام گفتگو سے قریب تر ہے۔ میر امن دہلوی اور غالب کی طرح اُن کے خاص اُسلوب کی بناء پر اُن کو دہلوی نثر میں چوتھا سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی شخصیت ایک عرصہ تک دلّی کا دوسرا نام بنی رہی۔ دلّی سے مراد یہ تھی کہ ایک بہت ہی خاص قسم کی گنگا جمنی تہذیب جس میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ شیرینی اور مٹھاس تھی۔ اس کے علاوہ سادگی اور دریا دلی کا عنصر بھی موجود تھا۔ تنگ دامانی اور تنگ نظری دور دور تک نہ تھی۔ غدر کے واقعات کو نئے انداز میں پیش کرنا شہر سے نہیں تہذیب سے شغف تھا اور اس شغف کی وجہ سے ایک مدت تک انسانوں کی محنت اور محبت کا سبب تھی۔ دلّی جس نے اُردو زبان کو عام کر کے ملک کے کونے کونے تک پھیلایا، اُس کی سادگی اور روانی آج بھی خواجہ صاحب کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ کتابی بوجھل پن سے نکال کر اُس پر پھر تیجی اور کھری اُردو کا نکھار لانا خواجہ حسن نظامی کی بڑی وارثت ہے۔

مصور فطرت شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی کی ذات ایک صوفی پیر طریقت کی حیثیت سے دنیائے علم و ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُن کی ذات کی ہمہ جہتی نے اپنے اندر لاتعداد خصوصیات کو کچھ اس طرح سمو دیا کہ وہ ایک قد آور شخصیت کے طور پر زندگی کے مختلف شعبوں پر چھا گئے۔ صوفی باصفا، پیر طریقت اور مذہبی پیشوا کے روپ میں اُنہوں نے بے شمار بندگان خدا کو فیضِ روحانی پہنچایا۔ اُن کے ہمہ گیر انداز نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا، اُس کا پورا حق ادا کیا اور اس کے عوض اپنے چاہنے والوں سے بھرپور خراج تحسین حاصل کیا۔

گزشتہ سالوں میں اہل قلم حضرات نے خواجہ حسن نظامی کی زندگی کے چند پہلوؤں پر اظہار خیال کے ساتھ ساتھ اُن کے کارناموں کو بھی سراہا۔ اُن کے علم و عمل، فکر و فن اور گفتار و کردار کے

نقوش پیش کر کے اُن کے علم اور سماجی خدمات کا اعتراف کر کے اُن کو سراہا ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی تحریر میں الفاظ کا رنگ اِس طرح بھرا ہے کہ وہ خود کہتے ہیں:

"شریعت ایک تھی لیکن ملکوں کی معاشرت اور حالات کے تحت ہادی، اپنے اپنے طریقوں سے لوگوں کو بھلائی کی دعوت دیتے رہے۔ شری رام چندر جی، شری کرشن جی اور مہاتما بدھ بھی خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ہادی تھے۔ اُنھوں نے اُس دور کے ہندوستان کے حالات کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کو اللہ تک پہنچنے کی راہیں بتائیں۔ انسانوں کو جابروں اور ظالموں سے نجات دلائی اور لوگ اللہ کی پہچان کر سکیں، اِس کا انداز بتایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اگر نمرود، موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور آنحضرت محمدؐ کو ابو جہل اور کفارِ مکہ سے واسطہ پڑا تو ہندوستان میں شری رام چندر کو راون اور کرشن جی کو کنس کا سامنا ہوا۔ ماحول مختلف ہونے کے باوجود حالات تقریباً ایک ہی قسم کے تھے جس سے یہ ہادیانِ دین دوچار ہوئے"......

خواجہ صاحب نے وید مقدس کا حوالہ دیتے ہوئے لب لباب کے طور پر اِس تجزیہ کا یہ نتیجہ نکالا!

"جس طرح سب پیغمبر ہمارے حضورؐ کی تصدیق کرتے آئے ہیں، ہندوستانی رسولوں نے بھی تصدیق کی ہے۔ پس ہندوستانی رسولوں کی اُمت کو بھی حضورؐ کی تصدیق کرنی چاہیے اور ہم کو بھی ہندوستان کے تمام رسولوں پر ایمان لانا چاہیے۔ اِسی میں ہندوستان کی ظاہری اور باطنی بہبودی ہے اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے"

خواجہ صاحب نے ایک وسیع النظر اور روشن خیال صوفی کی حیثیت سے ہندوستانی پیشواؤں کی تیرتھ استھانوں کی یاترا، سادھو سنتوں کا لباس پہن کر 1905-6ء میں بڑی عقیدت و شردھا سے کی تھی۔ وہ اپنی یاترا کے دوران متھرا، اجودھیا، بنارس، ہردوار اور رشی کیش گئے۔ وہاں ہندو سنتوں، فقیروں اور روحانی بزرگوں سے ملے اور اُن کے ساتھ مذہبی تبادلہ خیال کیا۔ بڑے بڑے مندروں کو دیکھا اور تمام حالات کا جائزہ لیا اور جب لوٹے تو اُن کے اپنے اُن کے مخالف ہو گئے اور اُن کو ہندو، کافر اور ملحد کہہ کر کفر کے فتوے لگائے مگر چونکہ وہ بھرپور عزم اور بلند حوصلہ لے کر پیدا ہوئے تھے لہٰذا پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کسی بات کی پروا کیے بغیر اپنے عزم پر قائم رہے۔ اُنھیں

سرزمین ہند کے ساتھ ہندوستانی مذہبی پیشواؤں سے جو ارادت تھی، یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اپنے قلم کی سیاہی سے قلمی چہرے تراشتے ہیں۔ منادی سے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ہندوستانی مذہبی پیشوا شری رام چندر، شری کرشن جی، گورو بابا نانک وغیرہ کے چہرے اِس قدر خوبصورت ہیں کہ اُن کے ساتھ گہری عقیدت کی جھلک نظر آتی ہے۔

نمونے کے طور پر کرشن جی کی تصویر ملاحظہ ہو:

"متھرا میں آدھی رات کو نکلنے والا چاند گوکل میں گئو اور بے زبانوں کا نگہبان بندرابن میں تلوار کھینچ کر کنس پر چڑھنے والا خدائی بہادر ہے"

من موہن، حسن یزدانی کی مورت، رب العالمین، جگ داتا کی رحمت کا سبق پڑھانے والا ہندوستان کا سب سے بڑا محبوب سے پیارا کشن کنھیا"

خواجہ حسن نظامی اپنے قلم سے کرشن جی کے نقوش بناتے چلے گئے اور اِس بات پر آخر کیا:

"رسیلی آنکھ نظر اُٹھا اور نگاہ ایک تیر اپنے داس کو دے کر دے کہ وہ بے تابہ پکارتا ہے!

"اک تیر پھینکتا جا بانکی کمان والے"

مزید یہ کہ اُن کے قلمی چہروں میں اللہ میاں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، آنحضرتؐ، گورو بابا نانک، مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جناح، مولانا ظفر علی خان، مفتی عنایت اللہ اور مولانا احمد سعید وغیرہ بھی شامل ہیں۔

گرو بابا نانک کے متعلق خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

"سچے خدا کا سچا ولی، توحید کا سمندر، حقانیت کا طوطی ہزار داستان، پانچ دریاؤں کے ملک میں حواس خمسہ کو شیریں گفتار سے درسِ وحدت دینے والا سکھ فرقے کا بانی"

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے فرمان کے مطابق تمام قوموں کے پیغمبروں اور مذہبی پیشواؤں کی تعظیم کرو۔ خواجہ حسن نظامی نے ہندوستان کے مسلم بزرگانِ دین اور اولیاء کی عملی زندگی کو اپنے کردار میں سمو لیا اور ہر مذہب و ملت کے رہنماؤں کی عزت و تکریم کرتے رہے۔ اپنی تحریر، اپنے رسالوں، کتابوں، روزناموں اور سفرناموں میں اُن کا ذکر بار بار کرتے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ

تمام مذاہب کی روحانی قدروں کی تبلیغ واشاعت کو عمر بھر سرانجام دیتے رہے۔

خواجہ صاحب نے اسلامی تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اُن کا موقف کچھ یوں تھا کہ کوئی تحریک چلا کر کسی مذہب کے پیروؤں کو ورغلانا اور اپنے مذہب میں شامل کرنا کسی معاشرے میں نئی کشمکش پیدا کرنا ہے۔ اِس لئے مزاحمت ضروری عمل ہے۔ اِسی وجہ کی بناء پر خواجہ صاحب انتہا پسندی کا جواب اپنی تلقین سے دیتے تھے۔ حق وانصاف کی آواز بلند کرتے ہوئے گھبراتے نہ تھے اور لگن کے ساتھ اپنے مشن پر ڈٹے رہے۔ جس کام پر جاتے' پورا کر کے چھوڑتے تھے۔

اس کا اقرار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

میرے اندر ضد اور ہٹ دھرمی کا مادہ پایا جاتا ہے اور اِس کو بعض حالات میں بُرا سمجھتا ہوں۔ باوجود رائے کی استقلاء کی ضد کے یہ عالم ہے کہ جب ایک بات ٹھان لوں اور اِس پر اڑ جاؤں تو خواہ وہ کیسی ہی نامناسب ہو' اِس سے دست بردار نہیں ہوتا' اِس پر اڑا رہتا ہوں"

خواجہ حسن نظامی حلیم الطبع' صلح کن' امن پسند اور دریا دل واقع ہوئے تھے۔ اتنے ہی اُصولوں پر کٹر تھے اور آسانی سے جھکتے نہیں تھے۔ اپنے اُصولوں اور اپنی بات پر عمل کروانا خوب جانتے تھے۔ ایک جگہ اُنہوں نے یہ کہا تھا:

"میں اِس قسم کے لوگوں سے بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا جو دوسرے مذہب کی دل آزاری جاری رکھتے ہوں۔ میرا مذہب صلح کن ہے" سب قوموں سے ملنساری برتنی چاہتا ہوں اور اگر کوئی خوامخواہ حملہ کرے تو منصفانہ جواب ہی میرے عقیدے میں ضروری ہے"۔

چونکہ آپ کا ایمان توحید تھا۔ اِس لئے سارے بندوں کو ایک خدا کی مخلوق تصور کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک کتابیں اور زبانیں اور تمام اشیاء ایک خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اِس لئے انسان اُسے کسی بھی راہ سے اپنا خدا مانے' خدا کی خدائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اِسے یاد کرنا شرط ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے۔ دُعا کو قبول کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بندوں کی زبان سے دُعا کے یہ الفاظ بھی کس قدر پُر انگیز نظر آتے ہیں' ذرا دیکھئے:

"تجھ کو داتا کہیں' تجھ کو مولا کہیں' تجھ کو داؤد کہیں' تجھ کو کیا کچھ کہیں' تو ہر ہے اور ہر سے آزاد' تو ہندو کا برہم اور اوم اور مسلمان کا اللہ' عیسائی کا گاڈ' سکھ کا اکال پورکھ' تو امیر اور غریب کو ایک نگاہ سے دیکھنے والا' ہماری دُعا اور پرارتھنا سن اور قبول کر"

خواجہ حسن نظامی کسی کی مصیبت اور تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے نزدیک امیر وغریب' مسلمان اور ہندو میں کوئی فرق وامتیاز نہیں تھا۔

1947ء کے فسادات کے زمانے میں جب بستی حضرت نظام الدین اولیاء کو خطروں کا سامنا ہوا تو خواجہ صاحب کے کہنے پر سردار پٹیل نے بستی میں مدراس رجمنٹ لگا دی تھی جو امن تک وہاں پر موجود رہی۔ سردار پٹیل اور جنرل کری اپا خود بھی بستی کی دیکھ بھال کیلئے آئے۔ مہاتما گاندھی اور خواجہ صاحب کے درمیان عزت کا رشتہ قائم تھا۔ دلّی میں گاندھی کا جب قتل ہوا تو آپ حیدرآباد میں تھے۔ اُنہوں نے آغا حیدر حسن دہلوی کے ہمراہ جب نظام کالج میں ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا تو آپ کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آپ نے اِن حالات کا مقابلہ کیا اور جلسہ ہو کر رہا۔ اُنہوں نے مہاتما گاندھی پر اپنے مخلصانہ اور دوستانہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اُنہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی خواجہ صاحب کو گہری عقیدت تھی اور وہ اُن کی بہت قدر کیا کرتے تھے۔

لفظ ثقافت میں بڑی وسعت و گہرائی ہے۔ اگرچہ سنسکرتی سنسکار کا ایک فعل ہے اور اپنے اصل معنی ہی میں یہ مستعمل ہے لیکن اِسی پر اکتفا ہے کیونکہ اس کے معنی سماج و زندگی کی ہمہ جہتی اصلاح' نشوونما اور ارتقاء پر بھی بھاری ہیں۔ اِس کا اطلاق رہن سہن' لباس' نیز علم وادب' فن وفکر' عمل' طور طریقہ' سیاست' فلسفہ' مذہب' اعتقاد' معیشت وغیرہ غرض کہ سماجی اور غیر سماجی لوازم زندگی پر بھی ہو سکتا ہے اور اِن سب کا تعلق محض اصلاحِ بشر اور اِس کی نشوونما اور ارتقائے حیات ہے۔

ہندوستان ایک خوبصورت گلشن ہے جس میں الگ الگ رنگوں کے پھول اپنی رعنائی سمیٹے ہوئے ایک جیسی مہک لئے ہوئے ہیں۔ اِس طرح ہندوستانی ثقافت کا تعلق ایک گنگا جمنی تہذیب سے رہا ہے اور اِس کی آبیاری میں مختلف قوموں اور دیگر مذاہب کا ہاتھ رہا ہے۔ اِس کو اگر ایک طرف نسلوں نے اُجاگر کیا ہے تو دوسری طرف اِس کو خوبصورت بنانے میں صوفی اور سنتوں کا بہترین رول رہا ہے۔

بات کچھ یوں ہے کہ مصنف جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے' اُس کے ذہن کے پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس کا ماحول اور عہد اُس کی تحریر کی خصوصیت بن جاتی ہے۔ خواجہ صاحب ایک زمانہ شناس انسان تھے۔ آنے والے وقت کو اپنے وجدان سے جانچ لیا کرتے تھے اور اِسی وجدان نے اُنہیں ایک اہم کام کی طرف لگا دیا۔ اُس دور میں جہاں ہر طرف اُردو اُس زمانے پر

سادگی، اختصار اور بذلہ سنجی کی کمی ملے گی۔ اس کے باوجود اُن کے صاحبِ طرز ادیب ہونے میں
کوئی شبہ نہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کے ہاں اِن تمام خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔ وہ اکثر ایک
معمولی عنوان سے شروع کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے مضمون کا تعلق اِسی بات سے ہے جسے
کوئی سرنامہ بنایا گیا ہو لیکن پھر آہستہ آہستہ مضمون کے پہلو اُجاگر ہونا شروع ہوتے ہیں اور آخر
تک جاتے جاتے اُس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اُن کا مختصر سا مضمون 'ہچکی' ہے
جسے اِس طرح شروع کیا ہے۔

"تو کیوں آتی ہے؟ میرا سجنا تو یاد نہیں کرتا؟ میرے من موہن سندر کے دل
میں تو میرا خیال نہیں آیا؟....... پھر آئی...... ہچکی...... نہ ستا میرا سینہ ناتواں ہے۔ اس
میں جگہ جگہ پھانسیں چبھی ہوئی ہیں۔ تو آتی ہے تو سینے میں کھٹک ہوتی ہے۔ اِس کے
زخم دکھنے لگتے ہیں۔ سانس رکا جاتا ہے"

مختصر سے مضمون میں ہر ہچکی پر اک نئے رخ کی دوڑ ملتی ہے۔ یہاں تک کہ زندگی آخری ہچکی
بن جاتی ہے اور ساجن وصیاء کائنات کے ذرے ذرے میں پوشیدہ خالقِ عالم کی شکل اختیار کر لیتے
ہیں۔

خواجہ صاحب کے کسی مضمون کو شروع کرنے کے بعد درمیان میں چھوڑ دینا مناسب نہیں
سمجھتے کیونکہ ہر لمحہ ایک تجربے سے ذہن کو دوچار کرتا ہے اور یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ آگے کیا ہے
۔ مثلاً ریل کے سفر میں ہم اکثر اوقات سفر تو کرتے ہیں لیکن خواجہ صاحب ریلوے لائن اور سگنل کو
دیکھتے ہیں تو اُن کا تاثر بالکل الگ ہوتا ہے۔

"جی آئی پی ریلوے کی لائن آئی' سگنل نے اپنی لال آنکھ دکھائی۔ اُس کا پھیلا
ہوا ہاتھ دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ جو اپنا ہاتھ دوسرے کے آگے پھیلاتا ہے اُس کی زندگی
کا راستہ رک جاتا ہے جیسے اِس سگنل کے پھیلے ہوئے ہاتھ کے سبب ریل اِس سڑک
پر نہیں آسکتی"

یا پھر اُن کے مضمون "لیمپ" میں اُن کا اُسلوب ملاحظہ ہو:

"لیمپ ایک ڈبیہ کا نام ہے خواہ وہ لوہے کی ہو یا کانچ کی۔ اِس میں تیل
بھر دیتے ہیں اور بیچ میں بتی الکا دیتے ہیں۔ پھر اس پر کانچ کی چمنی لگا دیتے
ہیں۔ یہ روشنی کا حجاب ہے۔ اس کے اندر بتی نئی روشنی کا تاج سر پر رکھ کر ملک ظلمات

فتح کر کے حکومت کرتی ہیں۔
پروانے بے چارے اِس روشن تاج کے دیوانے ہیں۔ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں
اور کانچ کے سفید پردے سے ٹکرا ٹکرا کر پڑتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں شمع کے رخ پر
جو حجاب لٹکایا جاتا ہے وہ دور اور نزدیک سے پردہ ہی معلوم ہوتا تھا مگر آج کل چونکہ
دنیا ہی دھوکے کی ہے۔ یہ پردہ بھی دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوتا ہے۔ ننھے سے پرندے کو
روشنی حجاب نظر آتی ہے۔ لیکن جب قریب جاتا ہے تو غریب مایوس ہو کر گر پڑتا ہے
اور منزل تک نہیں پہنچ سکتا"......

بات میں وزن پیدا کرنے کا فن وہ بخوبی جانتے تھے۔ الفاظ پر اُنہیں ایسی دسترس حاصل تھی
کہ لفظ مطلب کیلئے اُن کا محتاج ہو۔ اُن کے الفاظ جملوں میں اک جہان پوشیدہ نظر آتا تھا۔ معنی
ومفاہیم کی اِس تہہ داری کے باوجود اُن کے اُسلوب میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مثلاً اُن کے
مضمون "لاء" کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"انگریزی زبان میں اِس سربلندی کے معنی قانون اور ضابطے کے ہیں۔ عرب
والے انکار اور نفی کے وقت اِس کا استعمال کرتے ہیں۔ اہلِ اُردو تحکمانہ طلب کے
موقع پر "لاء" بولتے ہیں...... عرب کا "لاء" صورِ اسرافیل ہے۔ انگریزی لاء کی اس
کے سامنے حقیقت نہیں...... ایک ہی ضرب میں حکومت کے "لاء" کو نیست ونابود
کر سکتا ہے۔ حکومت کے "لاء" کی بساط ہی کیا ہے جو عربی لا کے سامنے آسکے"

ایک صاحبِ طرز انشاء پرداز کے اُسلوب کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ گڑھا ہوا اُسلوب نہ
ہو۔ کچھ لوگ اپنی انفرادیت جتانے کیلئے اپنے اُسلوب کو ایک خاص انداز بنانے کی کوشش کرتے
ہیں اور بعض اوقات کسی کے اُسلوب سے متاثر ہو کر اُس کے مقابل بنانے کی کوشش میں بعض
اوقات کامیاب نہیں ہو پاتے۔ مثلاً کچھ لوگ خطوطِ غالب سے متاثر ہو کر ویسا ہی اُسلوب بنانے
کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اُسلوب میں روانی رکھنے کیلئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً اُن
کے مضمون دیا سلائی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"آپ کون ہیں؟ ناچیز تنکہ؟ اسم شریف؟ دیا سلائی کہتے ہیں۔ دولت خانہ؟
جناب دولت ہے نہ خانہ...... اصلی گھر جنگل ویرانہ تھا مگر چند روز سے احمد آباد میں
بستی بسائی ہے اور سچ پوچھئے تو یہ ننھا سا کاغذی ہوٹل جس کو آپ بکس کہتے ہیں اور جو

آپ کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے' میرا وجود ٹھکانہ ہے...... میرے مذہب میں دیسی بدیسی گورے کالے کا فرق بھی جائز نہیں۔ مندر میں میرے دم سے روشنی ہے اور مسجد میں بھی۔ راجہ اور نواب کے محل کی تاریکی بھی دور کرتا ہوں اور غریب کے جھونپڑے میں بھی میرے سبب سے اُجالا ہوتا ہے"......

اِن کا اِس طرح کا مضمون دوا کی شیشی کے باطنی اشارے ہیں جس میں بیمار ہونے پر ڈاکٹر انصاری کے پاس جانا اور ڈاکٹر کی تشخیص کو کچھ یوں پیش کیا:

"جب ڈاکٹر انصاری نے کان میں وہ آلہ چڑھایا جسے کان کی عینک کہنا چاہیے اور حسن نظامی کے سینے کو دیکھنا شروع کیا تو حسن نظامی کی آنکھ نے ڈاکٹری سازوسامان سے باتیں کرنا شروع کیں اور اُن سے کچھ سنا۔ گویا ڈاکٹر صاحب کے کان نے دیکھا اور حسن نظامی کی آنکھ نے سنا"

خواجہ حسن نظامی کے اُسلوب میں تازگی ہے' مزاح کی صورت میں مسخرہ پن نہیں چھلکتا۔ رُلاتے ہیں لیکن مرثیہ گو نہیں۔ زبان کی فصاحت و روانی میں ایسا نایاب اُسلوب پیش کیا جو قابل تحسین بھی ہے اور زبان کی بقا کیلئے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قابل تقلید ہوگا۔

دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو دُعا کے بغیر ہو۔ اہل دل نے دعا کو مذہبی زندگی کی روح قرار دیا ہے۔ نیک صوفیائے کرام کے نزدیک مذہب کی جڑ دُعا ہے اور دُعا مانگنے کی گواہی قرآن مجید نے بھی دی ہے۔

دُعا سے مراد وہ پکار ہے جو ربّ العزت کے حضور بلند کی جاتی ہے۔ دُعا کا فلسفہ کچھ یوں ہے کہ انسان خالی ہاتھ ہے اور جب وہ درد دل کے ساتھ اپنی اپنی مجبوریوں کو خالی ہاتھوں میں خدا کے حضور پیش کرتا ہے تو اللہ کا کرم حاصل ہوتا ہے۔ انسان کی عبارت دُعا کے بغیر نامکمل ہے۔ سورہ مومن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "مجھ سے دُعا کرو میں تمہاری دُعا کو قبول کروں گا" آنحضرت کا ارشاد پاک ہے کہ "دُعا مومن کا ہتھیار ہے' دین کا ستون اور آسمان کا نور ہے۔ آنحضرت کا مزید ارشاد ہے کہ "دُعا عبادت بھی ہے اور عبادت کا مغز بھی"......

صوفیائے کرام کے ہاں دُعا ایک مستقل انسٹی ٹیوشن کی حیثیت اختیار کر گئی۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کی مشہور تصنیف "تاریخ اور عجیب وغریب تمدنی پیش رفت" جیسی تفصیلات والی کوئی دوسری کتاب آج تک سامنے نہیں آئی۔

خواجہ صاحب کی اِس کتاب میں مختلف زمانوں کے شاہی خاندان اور اُن کے حکمرانوں کے تذکرے ہیں جو اپنے وقتوں میں فرعون کے مترادف تھے۔ مزید یہ کہ خواجہ حسن نظامی کے نزدیک تاریخ صرف بادشاہوں کی فتوحات اور مہمات کے تعارف کا نام نہیں بلکہ دور زندگی کی مکمل تصویر کشی کا نام ہے اور اُن کی تحریروں میں قلعوں سے لے کر جھونپڑوں تک اور دربار و خانقاہ سے لے کر گلیوں اور بازاروں تک زندگی کا تمام رنگ اپنی تحریر میں بھر دیا۔ خواجہ صاحب اپنے رب کے ساتھ رابطے میں نہ تو حالی کے پیرو ہیں کہ اُف تک بھی نہ کریں اور نہ اقبال کے ہم مسلک کہ شکوہ جواب شکوہ پر اُتر آئیں۔ دُعا میں عاجزی سے اور ادب کے ساتھ مانگنا چاہیے اور اپنے ربّ کو اُس کے اچھے ناموں سے پکارو۔ اپنی دُعا میں اِس کا خیال کس حد تک رکھتے ہیں دیکھئے:

"بجلی میں چمکنے والے' چاند میں جھلکنے والے' رات کے اندھیرے' سورج کی روشنی' آسمان کی بلندی' دریا کی روانی' جنگل کی سنسانی' دل گیری و دلداری کے مالک عرش کی اقامت میں جدا' دل کے گھرانے میں خدا! ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں تو اگر عرش پر ہے تو ہم کو سربلند کر' فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عطا فرما' دل میں ٹھکانہ ہو تو اِس کو اپنے رہنے کے قابل بنا دے' رگ جان میں ہو تو خون میں اپنی شان اور آن بان کا جوش پیدا کر' اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا دے"......

خواجہ صاحب انسان کے مقام اور اُس کی عزت کا خیال رکھتے تھے۔ اُنہیں علم تھا کہ یہ اشرف المخلوقات زمین پر خدا کا نائب ہے اور اِس منصب کے باعث وہ اپنے رب کے حضور جس طرح چاہے' گزارش کر سکتا ہے۔ دُعا کے پیرایہ میں ایاک نعبد و ایاک نستعین کی تفصیل دیکھئے:

"تو عالم ہے' اپنے علم کا حصہ ہم کو بھی دے دے۔ رازق ہے' ہمارے ہاتھوں سے رزق بانٹ۔ رحمٰن ہے رحمت نازل فرما۔ قہر و جبر کی تلوار ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے۔ خیر کو وسعت دے' شر سے بچا۔ ہماری آنکھ بن' تجھ سے دیکھیں۔ کان بن تجھ سے سنیں۔ زبان میں تو ہی بول' ہاتھ سے تو ہی کام کر۔ تو بعید ہے تو قریب آ جا تو اقرب ہو جا۔ اقرب ہے تو نحن اقرب کا حجاب بھی اُٹھا دے"

تصوف کا محور عشق الٰہی ہے اور عشق کی تعریف کیا ہے اور خواجہ صاحب خود صوفی

تھے۔اِس لئے اُن کے ہاں دعا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بیت المقدس کے سفر پر 6 جولائی 1911ء کو خواجہ صاحب نے حضرت زکریا علیہ السلام کی محراب میں حاضری کے وقت جو دعا کی ملاحظہ ہو۔

"زکریا کے رب، اپنے بندے کی ندا کو رحمت سے سننے والے خدا جب زکریا نے اِس محراب میں بیٹھ کر تجھ سے کچھ مانگا تو تیرے قول کے موافق چپکے سے مانگا جس کو تو نے سن لیا اور زکریا کے دامن مراد کو گوہر مقصود سے بھر دیا۔ تا کہ میں ندائے خفی سے پکاروں یا صدائے جہر لگاؤں۔ زکریا عمر میں بوڑھے تھے اور میں قویٰ کے اعتبار سے ضعیف۔ زکریا نے اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کی شکایت کی تھی اور مجھ کو اپنی قوم کے بانجھ ہونے کا شکوہ ہے یعنی اِسے نمو کی صفت مفقود ہو گئی ہے۔

دعاؤں کی صورت میں درد تڑپ قلب کی بیداری کے نمونہ کے طور پر تھے ورنہ سی پارہ دل میں تو پہلی منزل ہی عبد و معبود کے راز و نیاز کی ہے جس میں لفظوں کی ٹولیاں بھی ہیں اور موسم کی خوبصورتی بھی، آنکھ میں اشکوں کی التجا بھی ہے اور انسانوں کی مشترکہ دعا بھی جس میں دین و دنیا کی حاجات کیلئے اپنے رب سے رجوع کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کے ہاں دعا اِس حقیقت کی رہنمائی ہے۔ حرکت میں برکت پر ایمان راسخ ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

"آج کل اکثر مسلمان کاہل وجود ہو گئے ہیں۔ اُن سے محنت اور کوشش نہیں ہو سکتی اور محض یہی دعائیں پڑھ کر انتظار کرنے لگتے ہیں کہ غیب سے رزق آ جائے گا اور خزانہ الٰہی سے دولت برسنے لگے گی۔ حالانکہ اِن دعاؤں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان کی ظاہری محنت اور کوشش بھی کرے اور دعائیں بھی پڑھ کر پروردگار کی امداد و برکت بھی چاہے۔ محض اِس بھروسہ پر نہ بیٹھا رہے کہ اِن دُعاؤں کی برکت سے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر روپیہ آ جائے گا۔ قرضہ اُتر جائے گا اور مفلسی دور ہو جائے گی۔

وہ اُن مفلسوں، نکھے اور بیکاروں سے تنگ تھے جو رات دن صرف وظیفے پڑھتے رہتے اور رزق حلال کیلئے محنت نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:" انسان کو اِس عالم اسباب دنیا میں کوشش کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ دعا کے ساتھ ساتھ جدوجہد بھی ضروری عمل ہے"......

بنی نوع انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا گیا اور خاک کے خمیر سے اُٹھایا اور اسی خاک میں سُلا دیا جائے گا۔ انسان کا اپنا مقدر ہوتا ہے کہ کسی کو تخت شاہی ملا اور کسی کو مٹی کا حجرہ لیکن موت نے اِس فرق کو ختم کر دیا اور بادشاہ ہو یا فقیر، سب کو اپنی چھاتی میں سمیٹ لیا اور پھر خاک کو خاک میں ہی ملا دیا۔

جس طرح زندگی اور موت کے راز کو کوئی نہ جان سکا۔ اِسی طرح مقدر کی تحریر کو کوئی نہ پڑھ سکا۔ فطرت انسان کی محتاج ہے۔ علم کی دولت سے سرفراز ہونے کے بعد انسان نے کیا نہیں پایا۔ سلطنت کرنا اور اُس کے قواعد و ضوابط بنانا، صلح دامن سے رہنا، دوست احباب میں رہنا، جائز طریقوں سے رزق حاصل کرنا۔ غرض کونسی ایسی بات ہے جو علم تاریخ انسان کو نہیں بتاتا۔ مختلف واقعات جو اولاً طبعاً اِس کو عارض ہوں۔ مثلاً بسنا، اُجڑنا، بچھڑنا، رونا، جھگڑنا وغیرہ تاریخی واقعات ہیں جن کو فراہم کرنے کیلئے آئندہ نسلوں کی عزت و نصیحت چھوڑ جانے کو تاریخ کہتے ہیں۔

دہلی کے غدر پر 1857ء میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے بارہ حصوں پر مشتمل تاریخی واقعات تحریر کئے ہیں لیکن اِس کے اوّل حصہ "بیگمات کے آنسو" کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ انقلاب (1857ء) کے بعد اِن واقعات اور کہانیوں میں، جو دل میں درد اور آنکھوں میں آنسو لے آتی ہیں، اُنہوں نے اُس عہد کے اختتام کے بعد نہایت غمزدہ اور دلدوز انداز میں پیش کئے ہیں۔ شہزادیوں اور شہزادوں کی بے بس و مجبوری پر اپنے دل میں ہمدردی کے جذبات محسوس کئے ہیں...... ہمدردی کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر سامان عبرت فراہم کیا ہے اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر، اُنکی بیگمات، شہزادوں، شہزادیوں اور لال قلعہ میں بادشاہ کے دوسرے عزیز و اقارب کی سچی دل خراش کہانیاں دل میں ایک ایسا درد پیدا کرتی ہیں کہ اپنے گناہوں سے توبہ کیلئے اللہ کے حضور بندہ اشکوں کی لڑیوں میں اپنے گناہوں پر ندامت محسوس کرتا ہے۔

اِن کہانیوں کو پڑھ کر قاری دکھی اور سننے والا زار و قطار روتا ہوا نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اِنہیں تحریر کر کے اِک محفل غریباں کا اہتمام کر دیا ہے۔

ملا واحدی نے بیان کیا ہے کہ اِن مضامین کو پڑھ کر لوگ بے حال ہو جاتے اور سخت دل حضرات بھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے اور تو اور میں نے خود خواجہ صاحب کو اپنے اِن مضامین کو پڑھ کر روتے دیکھا۔ اِن دل خراش اور سوز بھری داستانوں پر مشتمل اِس کتاب کا نام "بیگمات کے آنسو" ہے جو پہلے "غدر دِلّی" کے نام سے شائع ہوئی۔ پھر مزید افسانوں کے اضافہ

کے بعد اِس کا نام "بیگمات کے آنسو" رکھ دیا گیا۔

افسانے سے یہ قیاس کرنا ہے' یہ فرضی کہانیاں ہیں تو غلط ہوگا بلکہ یہ سچی کہانیاں ہیں۔ حقائق کے غلاف میں لپٹی ہوئی یہ حقیقت میں سچائی اور حقیقی کہانیاں ہیں اور کہیں کہیں پر وقتی مصلحت کے تحت تھوڑی بہت رنگ آمیزی لئے ہوئے ہیں۔ اِس بارے میں خواجہ صاحب خود کہتے ہیں:

"دنیا خیال کرے گی کہ یہ میرے لکھنے کی خوبی ہے۔ نہیں نہیں! اِس کتاب کا اثر یا اِن واقعات وحالات کی وجہ سے ہے جو اِس کتاب میں مذکور ہیں۔ میرا کام تو واقعہ کو موزوں اور عام فہم الفاظ میں بیان کر دینا تھا' سو بیان کر دیا۔ اِس کتاب میں بعض قصے فرضی بھی ہیں لیکن بالکل فرضی نہیں یعنی مصلحت وقت کے تقاضے سے بعض واقعات کو ایسے طریقے سے بیان کیا گیا ہے جو اصلیت کے خلاف ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مصیبت میرے بیان سے زیادہ تھی اور زیادہ ہے۔ میری یہ کتاب تو ایک انقلاب کی دردناک تاریخ ہے۔ ایک بڑی مصیبت کا مرثیہ ہے اور اُردو نثر میں ایک سادہ اور عام فہم نوحہ ہے"......

تبصرہ

"بیگمات کے آنسو" سترہ قصوں پر مشتمل ہے۔ ہر قصہ اپنے اندر ایک کرب ودکھ لئے ہوئے ہے۔ دلّی کے غدر 1857ء کے بعد کے واقعات ہر دور جانے والے کی داستان اشک در اشک' ہر گزرنے والے دور کے دکھ بیان کرتی رہی۔ اِس طرح دلّی میں غدر کے بعد لٹتے قافلے اور کہیں کسی شہزادے کا رات کے اندھیرے میں بھیک مانگنا اور کسی کہانی میں شہزادیوں کے اُوپر ظلم وستم اور پھر کہیں دوسروں کے روزے کا اہتمام کرنے والے خود فاقے میں روزہ رکھنا پڑا۔

دکھ درد کسی خاص وقت کے پابند نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات کسی کہانی یا قصے سے ایک مدت سے قاری کے دل میں قیام کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ جذبات اِن کہانیوں میں بھی ہیں اور اِس کتاب "بیگمات کے آنسو" شہزادیوں کی درد والم کی اِسی حقیقت پر مبنی ہے۔ اِسی نسبت سے اِس کا نام رکھا گیا ہے۔

وعظ کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اثر پیدا کرنے کیلئے ایک خاص کیفیت پیدا کرے تاکہ سننے والے پر اِس کے واعظ کا اثر ہو۔ لیکن خواجہ حسن نظامی نے اِس کتاب میں بناوٹ یا قیاس سے کام

نہیں لیا لیکن دہلی کے شاہی خاندان کے ساتھ کیا ہوا' جو اِس کو سنتا ہے رونے لگتا ہے۔ مسلمان قوم پر اور اُس کی حکومت میں انقلاب آئے' جس نے مسلم اقتدار کی جڑیں تک ہلا دیں مگر جو انقلاب غدر دہلی میں آیا' جس کی تاریخ کربلا کے واقعات کے بعد دنیا کی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

ایک قوم پر زوال آنا اور ایسی قوم پر جو ایک خاص رعب ودبدبہ والی قوم کی تباہی آنا اتنا آسان نہ تھا۔ اِن واقعات میں درد کی اک لہر دل میں اُترتی محسوس ہوتی ہے اور ہر خاندان میں اسپین کے غرناطہ کا دردناک اور حسرت زدہ ڈرامہ نظر آئے گا۔

یہ دل خراش واقعات اپنے اندر شام غریباں کی جذبیت لئے ہوئے ہیں۔ کل کی فکر اگر اُنہیں ہوتیں تو وہ کبھی اپنے آج کو ضائع نہیں کرتے۔

جب انگریزی توپوں نے کوچوں اور سنگینوں نے چلمنہ توڑ جوڑنا اور شہزادوں سے تلواریں چھین لیں۔ تاج سروں سے اُتار لئے اور تخت پر قابض ہوئے۔ شہر میں گولیوں کی بارش ہو چکی۔ سات پردوں میں رہنے والیاں بے چادر وبے بس ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی لاشیں دیکھنے کو نکل آئیں۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ابا اماں پکارتے ہوئے بے یار ومددگار پھرنے لگے۔ عورتوں سے چلنا دشوار ہوا۔ کسی شہزادے کی بوڑھی ماں ٹھوکریں کھاتی اور چلتی ہوئی نوحہ یوں بیان کرتی ہے:

"تقدیر اُن کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے اُن کو بے بس کر دیا جو بیکسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیزی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہان کے گھر والے ہیں جس نے لیلا کا قبر پر جواہر نگار وبہار دکھا دی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنا دی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے ہیں۔ ہم عزت والے تھے۔ زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے۔ آج ہم پر آسمان روتا ہے"......

تہجد میں نماز کے بعد جب فاقے سے روزہ رکھنے کی نوبت آئی تو اپنے رب سے کچھ یوں فریاد کی:

"ہم نے ایسا کیا قصور کیا ہے جس کی سزا یہ مل رہی ہے۔ رمضان کے مہینے میں

ہمارے گھر سے ہزاروں محتاجوں کو کھانا ملتا تھا اور آج ہم خود دانے دانے کو محتاج ہیں اور روزہ رکھتے ہیں خداوند! اگر ہم سے قصور ہوا ہے تو اس معصوم بچی نے کیا خطا کی جس کے منہ میں کل سے ایک کھیل اُڑ کر نہیں گئی"

ایک اور مقام پر شاہ ہند کے گھرانے درویشانہ رنگین لباس میں تھے۔ ایک ہندو جس کی عدن میں دوکان تھی اور جو ہمارے حال سے بے خبر سوال کو بیٹھا کس پنتھ کے فقیر ہو۔ سوال نے چور چور کر دیا۔ جواباً کہا:

"ہم مظلوم شاہ گرو کے چیلے ہیں۔ وہی ہمارا باپ تھا وہی ہمارا گرو۔ پاپی لوگوں نے اُس کا گھر بار چھین لیا اور ہم کو اُس سے جدا کر کے جنگلوں میں نکال دیا۔ اب وہ ہماری صورت کو ترستا ہے اور ہم اُس کے دشمنوں کے بغیر بے چین ہیں"

ایک اور موقع پر سپاہیوں نے شہزادی کی بہن اور ماہ کے کانوں کو نوچا اور قید میں ڈال دیا۔ والدہ سے جدائی کے وقت یہ نوحہ والدہ نے کہا:

"ارے میرے لال کو چھوڑ دو...... تم نے میرے سرتاج کو خاک میں سُلا دیا۔ اِس یتیم پر رحم کرو۔ میں رنڈیا کس کے سہارے رنڈاپا کاٹوں گی۔ اللہ میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ میرا دلدار کہاں ہے۔ کوئی اکبر و قبر سے بلائے۔ اِن کے گھرانے کی دُکھیا کی بپتا سنائے۔ دیکھو میرے دل کے ٹکڑے کو مٹھی میں مسلے دیتے ہیں۔ ارے کوئی آؤ' میری گودیوں کا پالا مجھ کو دلواؤ"

اُونچے مکان تھے جن کے بڑے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے
باقی جو کچھ ہے وہ فانی ہے

اور رزق کا سامان کچھ یوں تھا۔ پانچ روپے پنشن مقرر کر دیئے جاتے تھے۔ لونڈیوں سے

دوگنی مشقت کرنا پڑی۔ اِن واقعات اور کہانیوں پر یہ مصرع تو بالکل ہو بہو صادق آتا ہے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

یہ واقعات ہر دور میں درد کو زندہ کریں گے۔

خواجہ صاحب دنیائے ادب میں ایک منفرد ادیب کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں اور اُن کے نزدیک ادب ابلاغ کی مانند ہے لیکن اُن کے معاملے میں ہوا یہ کہ جو در حقیقت ذریعہ تھا وہی آگے چل کر اصل قرار پایا حالانکہ اصلاً وہ ایک مبلغ تھے۔

خواجہ صاحب نے دیگر مذاہب پر چھوٹے بڑے ہر قسم کے مضامین لکھے۔ تصوف کے مسائل حل کئے۔ بخاری شریف کے پاروں کو اُردو میں منتقل کیا لیکن جس تحریر نے اُن کو عزت سے نوازا' وہ اصلاً قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کی وجہ سے ہے۔

خواجہ صاحب زندگی کے ہر رخ میں منفرد انداز لیے ہوئے ہیں اور قرآن کے ترجمے کے میدان میں بھی اُنہوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اُس زمانے میں ترجمے اور شرحی نوٹوں کا رواج کچھ اس طرح تھا کہ بین السطور میں تو اُردو ترجمہ دیا جاتا تھا اور حاشیوں پر تفسیر اور تشریح ہوتی تھی لیکن خواجہ صاحب نے اپنا الگ انداز اپنایا۔ وہ پہلے قرآن مجید کی ایک آیت لکھتے ہیں۔ اِس کے نیچے شاہ رفیق الدین صاحب کا اُردو ترجمہ دیتے ہیں جو صحت کے اعتبار سے سند کا درجہ رکھتا ہے۔

اُنہوں نے آیات کا ترجمہ فصیح ہندی میں بھی کیا۔ خواجہ صاحب کی خدمت قرآنی پر روشنی ڈالنا ایک مشکل امر ہے لیکن چند حرفوں میں اُسے سمیٹا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے مختلف اوقات میں جو بھی ترجمے شائع کئے اُن میں کوئی نہ کوئی ندرت ضرور رکھی۔ اُنہوں نے ترجمہ اور تفسیر کا کام اِس طرح کیا کہ پڑھنے والے اُکتاہٹ محسوس نہ کریں۔ قرآن مجید ہر ملک اور قوم کیلئے ہے۔ اُنہوں نے ایسا ترجمہ شائع کیا جس میں قرآن کے اِس دعویٰ کو پوری طرح سے اُجاگر کرنے کی تمام کوشش کر ڈالی اور انسانوں کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا اور قرآن مجید کے نئے نئے معانی اُن پر کھلتے چلے جائیں گے اور قرآن انسانوں کی ہدایت کیلئے نازل کیا ہے۔ اِس کو فرشتوں کی قسمیں کھانے اور اُن کو اہمیت دینے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ روایتی روایتوں کی تقلید نہیں کی بلکہ قرآن کے الفاظ سے جو نکلتا ہوا معلوم ہوا' وہی اُنہوں نے ترجمے میں ادا کیا۔

فرعونی تاریخ خواجہ حسن نظامی کا ایک نہایت اہم ادبی وتاریخی کارنامہ ہے۔ سنسکرت ادب میں قلم کو آبشار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کا قلم بھی آبشار کی طرح زندگی کی روحانی قدروں اور مادی حقائق کے مابین ایک خوبصورت روشن خط کھینچتا ہوا نظر آتا ہے۔

سن 1942ء میں جب دوسری عالمی جنگ کے خوفناک سائے اپنے اندر تباہی کا عنصر لئے گو بہ گو پھیلے ہوئے تھے تو اُس وقت وہ اپنی اِس تاریخی کتاب کی اشاعت کے اہتمام میں مصروف تھے۔

جس وقت اُن کی عمر ساٹھ برس کی تھی تو چھوٹی بڑی دوسو کے قریب کتابوں' کتابچوں اور رسالوں کے مصنف بن چکے تھے۔ خواجہ صاحب کو تاریخ فرعون جیسی عجیب وغریب تصنیف کی اشاعت سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"میں نے فرعونی تاریخ کی ابتدا سنہ 1911ء میں خود مصر جاکر شروع کی اور انتہا اب 1942ء میں ہوئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ میرے خاص شوق کی کتاب ہے۔ اِس میں مختلف زمانوں کے شاہی خاندانوں اور اُن حکمرانوں کا ذکر ہے۔ سو وہ سبھی فرعون کہلاتے تھے۔ اِس کے علاوہ مصر کی تہذیب ومعاشرت 'ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر مواد جمع کیا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک تاریخ صرف بادشاہوں کے ذکرواذکار کا نام نہیں بلکہ دورِ زندگی کی مکمل اور مربوط تصویر کا نام ہے جس کے تمام انداز قلعوں سے لے کر جھونپڑوں تک اور دربار وخانقاہ سے لے کر گلیوں اور بازاروں تک زندگی کا تمام تصور ورنگ سمٹ آتا ہے"......

گو کہ مختصراً اِس کم لکھنے میں میری کوشش تھی کہ خواجہ صاحب کی شخصیت اور فنی حسن پر روشنی ڈالی جائے۔ زیادہ تو نہیں لیکن پھر بھی بہت سے پہلوؤں پر الفاظ بندی کردی ہے۔

عائشہ احمد عاشی

جون 2008ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غدر 1857ء کے افسانے

تمہید

میں نے دہلی کے غدر 1857ء کی نسبت بارہ حصوں پر تاریخی واقعات لکھے ہیں جن میں پہلا حصہ "بیگمات کے آنسو" بہت ہی زیادہ مقبول ہے۔

پہلے یہ کتاب چھوٹے سائز پر "غدر دہلی کے افسانے" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ پھر اس کتاب میں نئے افسانوں کا اضافہ ہوا اور "آنسو کی بوندیں" نام رکھ کر شائع کیا۔ پھر اور افسانے بڑھا کر "بیگمات کے آنسو" نام رکھا گیا۔

اب تک اس کتاب کے دس ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

اِن مضامین کی نسبت ہندوستان کے اکثر اہلِ قلم کا خیال ہے کہ یہ میری تحریروں میں سب سے اعلیٰ ہیں اور اُردو انشاء پردازی میں اِن کا بڑا درجہ ہے۔

میرے دوست اور آنریبل مولانا سرسید احمد خان بہادر کے پوتے سیّد راس مسعود صاحب عرف نواب مسعود جنگ بہادر نے اسی بناء پر کئی سال ہوئے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اِن افسانوں کا ایک خاص ایڈیشن شائع کروں جس کا کاغذ چھپائی اور لکھائی اور جلد بندی ایسی عمدہ ہو کہ اِس کو لائبریری ایڈیشن کہہ سکیں۔

میں نے اپنے دوست کے کہنے کے موافق اِس کا اہتمام کیا اور کتاب لکھی گئی اور پریس میں بھی چلی گئی تو مجھے خیال آیا کہ اِس کی کتابت اعلیٰ نہیں۔ اِس کے علاوہ اِس میں بعض افسانے ایسے بھی ہیں جن کو خود میرا دل اعلیٰ اور موثر اُردو انشاء پردازی کا نمونہ نہیں مانتا۔ اِس لئے میں نے کتاب پریس سے واپس منگا کر ضائع کردی۔

اب پھر سیّد راس مسعود جب یورپ جانے لگے اور میں اُن سے ملنے علی گڑھ گیا تو اُنہوں

نے گذشتہ فرمائش کا یاد دلایا تو مکرر افسانوں کا انتخاب کیا گیا اور طویل افسانے اور غیر موثر افسانے خارج کر کے چند ایسے افسانے جن کو میرے دل نے بھی پسند کیا' ایک سلسلہ میں مرتب کئے اور چند بالکل تازہ افسانے جو میں نے ابھی حال میں لکھے تھے' اِس میں شریک کر دیئے۔

اب یہ مجموعہ اِس حد تک قابل ہوگیا ہے کہ اُردو لائبریری کے کسی نیچے کے خانہ میں اِس کو جگہ دی جائے (پورے اور مکمل افسانے بیگمات کے آنسو کتاب میں ہیں' اِس میں نہیں ہیں)

یہ تمہید ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے قدر دان دوست اور ہندوستان کے تعلیمی نجات دہندہ سر سیّد کے پوتے سیّد راس مسعود سے کہوں کہ لیجیے جناب آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دی۔ اگر یہ چیز اچھی ہوگئی تو آپ کی نذر کرتا ہوں ورنہ مہربانی کر کے اِس کے عیب کا کسی سے ذکر نہ کیجیے تا کہ میرا دل ٹوٹ نہ جائے۔

میں نے تو درحقیقت یہ کتاب مرنے والی تہذیب اور تاریخ کا نوحہ لکھنے کیلئے تیار کی تھی' مرثیہ کو لائبریری سے کیا تعلق؟

خواجہ حسن نظامی

15 اکتوبر 1940ء

شہزادہ خانساماں

بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں مہاراجہ بھاؤنگر ٹھہرے ہوئے تھے۔ برسات کا موسم تھا' سمندر میں صبح شام طوفان برپا رہتا تھا اور پانی کی آوازوں سے مسافروں کو قریب کی بات سُننی بھی دشوار تھی۔

تاج محل ہوٹل میں ایک خانساماں ستر اسی برس کی عمر کا نوکر تھا جو اپنے کام میں بہت ہوشیار اور تجربہ کار مانا جاتا تھا۔ ہوٹل والے اپنے بڑھیا مہمانوں کی خدمت مدارات کیلئے اِسی خانساماں کو مقرر کرتے تھے۔ اِس خانساماں کا نام قسمت بیگ تھا۔ اُس کی دیانت داری بھی شہرہ آفاق تھی۔ جب سے ہوٹل میں نوکر ہوا تھا' بارہا ہوٹل کے منیجر کو اُس کی امانت و دیانت داری کے تجربے ہوئے تھے اور وہ ہوٹل کے سب نوکروں سے زیادہ اِسی خانساماں پر اعتماد کرتا تھا۔

ایک دن صبح کے وقت مہاراجہ بھاؤنگر نے پلنگ پر لیٹے لیٹے قسمت بیگ سے کہا: میں نے بمبئی کے چند مہمانوں کو لنچ کی دعوت دی ہے' منیجر سے کہہ دینا کہ دس مہمانوں کا انتظام کر دے۔ سمندر کے پانی کا غل شور' برسات کا زمانہ' مہاراجہ بھاؤنگر کی دھیمی آواز' اور بہرہ خانساماں' یہ حکم کیوں کر اُس کے کانوں تک پہنچتا مگر قسمت بیگ کی تمیز داری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنا بہرہ پن ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ ہونٹوں کی حرکت سے مطلب سمجھ لیتا تھا۔ بہرہ آدمیوں کی طرح کان جھکا کر بات نہ سنتا تھا۔ آج ایسے اسباب جمع ہوئے کہ قسمت بیگ مہاراجہ کے حکم کو نہ سمجھا اور اُس نے ذرا پلنگ کے قریب آ کر نہایت تہذیب اور ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر سوال کیا: جو ارشاد ہوا ہے اُس کی تعمیل کی جائے گی لیکن اگر تکلیف نہ ہو تو تھوڑی سی تفصیل اور فرما دی جائے۔ مہاراجہ بھاؤنگر بالکل نہیں سمجھے کہ خانساماں نے اُن کی بات نہیں سنی تھی اور اُنہوں نے خانساماں سے دوبارہ کہا کہ دس آدمیوں کو بلایا ہے' وہ اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں' لنچ کا اہتمام اعلیٰ قسم کا ہونا چاہیے۔ قسمت بیگ نے بات سمجھ لی اور ادب سے کہا: جو حکم' فرمان کی پوری تعمیل کی جائے گی اور یہ کہہ کر بڑی تمیزداری

کے ساتھ پچھلے قدم چل کر سامنے سے ہٹ گیا۔

مہاراجہ بھاؤنگر دیر تک سوچتے رہے کہ انگریزی ہوٹلوں میں سب خانساماں انگریزی ادب وآداب استعمال کرتے ہیں' یہ بڑھا کون ہے جو پرانے زمانے کے مشرقی ادب وآداب کو استعمال کرتا ہے' اِس کا حال معلوم کرنا چاہیے۔ اُنہوں نے فوراً بٹن دبایا اور کمرے کا خدمت گار حاضر ہوگیا۔ مہاراجہ نے حکم دیا: آج جب ہم لنچ سے فارغ ہوں تو ملاقات کے کمرے میں قسمت بیگ خانساماں کو بلایا جائے' ہم اُس سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ خدمت گار نے کہا: حضور! وہ بہت بدمزاج آدمی ہے' صاحب لوگوں سے ہمیشہ لڑتا رہتا ہے' آپ اُس سے پرائیوٹ باتیں کریں گے تو وہ آپ سے بھی گستاخی سے پیش آئے گا۔ وہ نوکری کے وقت تو بہت اچھا ہے اور 'صاحب لوگ اُس کو پسند کرتے ہیں لیکن پرائیویٹ وقت میں وہ بہت بدمزاج ہوجاتا ہے۔ مہاراج نے کہا: ایسا کیوں ہے؟ خدمت گار نے جواب دیا: حضور! وہ کہتا ہے کہ میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں۔ اِس لئے صاحب لوگوں کا خیال ہے کہ اُس کے دماغ میں کچھ خرابی ہے۔ یہ سن کر مہاراجہ کو بہت تعجب ہوا اور وہ مسکرا کر خاموش ہوگئے اور کچھ دیر بعد اُنہوں نے خدمت گار سے کہا: کچھ پروا نہیں' قسمت بیگ سے کہہ دو کہ وہ لنچ کے بعد پرائیویٹ باتوں کیلئے ہمارے پاس آئے۔ خدمت گار نے انگریزی سلام کیا اور انگریزی طریقہ سے باہر چلا گیا۔

لنچ کے بعد

مہاراجہ بھاؤنگر اور ٹائمز آف انڈیا اور بمبئی کرانیکل اور سانجھ ورتمان کے ایڈیٹر اور چند چند ہندو اور پارسی عمائد بمبئی' دوپہر کا کھانا کھا کر باتوں کے کمرے میں آئے تو مہاراج نے قسمت بیگ کو بلایا۔ قسمت بیگ نہایت ادب سے حاضر ہوا اور اُس نے ہندوستانی طریقہ کے موافق مہاراج کو تین فرشی سلام کئے اور ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔ مہاراج نے کہا: قسمت بیگ! تم کون ہو؟ قسمت بیگ دانستہ مہاراج کی کرسی کے قریب کھڑا ہوا تھا تاکہ اُس کے بہرہ پن کا عیب چھپا رہے اور وہ مہاراج کی بات سُن سکے۔

مہاراج کا سوال سن کر قسمت بیگ نے کہا: حضور گستاخی معاف! اِس کا جواب تو آپ کو بھی نہیں معلوم ہے کہ ہم سب کون ہیں اور کیوں اِس دنیا میں پیدا کئے گئے ہیں۔ ہم کو بھوک' پیاس' نیند' بچپن' جوانی' بڑھاپا' تندرستی' بیماری کے انقلابات میں کس غرض سے مبتلا کیا گیا ہے۔

قسمت بیگ کی یہ عجیب تقریر سُن کر سب حاضرین مبہوت ہوگئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ ایک خانساماں کیسی فلسفیانہ باتیں کر رہا ہے۔ مہاراج نے مسکرا کر کہا: بے شک! ہم کو اِس سوال کا جواب معلوم نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نے زندگی میں اِن مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ تم نے ایک ہی سانس میں سب بڑے بڑے انقلاب کا ذکر کردیا۔ اِس واسطے میرا خیال ہے کہ تم میرے سوال کا جواب دے سکتے ہو۔

قسمت بیگ نے کہا: حضور! میں ایک آدمی ہوں' نسل کے لحاظ سے تیمور مغل ہوں' پیشہ کے لحاظ سے تاج محل ہوٹل کا خانساماں ہوں' عمر کے لحاظ سے بڑھا ہوں' طبیعت کے اعتبار سے کبھی بچہ ہوں اور کبھی جوان۔ اخلاقی حیثیت میری ایک کامل انسان کی ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا' چوری نہیں کرتا' ظلم اور بے رحمی سے بچتا ہوں' خدمت خلق کو اپنا مقصد زندگانی مانتا ہوں۔ اگرچہ گداگر ہوں لیکن دل کے تخت پر شہنشاہ بادشاہ ہوں کچھ اور ارشاد ہو تو اِس کا جواب بھی دوں؟

قسمت بیگ کی موثر اور مسلسل اور برجستہ تقریر کا ایک دوسرا اثر پیدا ہوا اور مہاراج مہمانوں سمیت پوری طرح اُس کی طرف متوجہ ہوگئے اور بے اختیار مہاراج کی زبان سے نکلا: تم تیموری شہزادے ہو؟ قسمت بیگ کو جوش آگیا اور اُس نے کہا: شاہ زادہ نہیں ہوں' آہ زادہ ہوں۔ دنیا کی مصیبتوں کی سب زدیں میں نے اُٹھائی ہیں۔ تیموری خاندان تو اب مٹ چکا' جس نے باوجود انسان ہونے کے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی تھی اور غلام بنالیا تھا۔ آپ نہیں تو آپ کے باپ دادا بھی اُس کے غلام تھے۔ یہ سوال فضول ہے اور آپ کیلئے تکلیف دہ ہے اور میں اِس سوال کی کشمکش میں پڑنا اپنے دل کیلئے ایک آری سمجھتا ہوں جو میرے دل کو چیر رہی ہے۔

یہ فقرہ سن کر مہاراج نے سر جھکالیا اور سب لوگ خاموش ہوکر زمین کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر کچھ دیر بعد خود قسمت بیگ نے کہا: انسان کو اپنی موجودہ حیثیت دیکھنی چاہیے۔ آج چونکہ میں ایک خانساماں ہوں' اِس لئے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ حضور میری زندگی کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ماضی پر فخر کریں یا افسوس کریں اور میں اُن لوگوں میں بھی نہیں ہوں جو مستقبل کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں۔ حضور میں ماضی کا مالک ہوں' حال کا مالک ہوں اور مستقبل کا بھی مالک ہوں۔ یہ آسمان بھی میرا ہے' زمین بھی میری ہے' یہ سمندر بھی میرا ہے اور آپ سب لوگ جو کرسیوں پر میرے سامنے بیٹھے ہیں' آپ بھی میرے ہیں' اور میں خود جو آپ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں' محسوس کرتا

ہوں کہ یہ وجود بھی میرا ہے' دنیا کی کوئی بھی چیز میرے سوا اور کسی کی نہیں ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دوسرا کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ میں ہی ہوں' میں ہی تھا' میں ہی آخر تک رہوں گا۔ یہ سمندر اُبل رہا ہے' بل کھا رہا ہے' جوش میں آ رہا ہے' برسات ختم ہو گئی' سردی آئے گی' ٹھنڈا ہو جائے گی' تالاب بن جائے گا۔ اِس کے اندر طوفان بھی میں ہی ہوں اور اِس کی ٹھنڈک بھی میں ہی ہوں۔

قسمت بیگ کی مجذوبانہ تقریر سنتے سنتے مہاراج کو ہنسی آ گئی مگر اُنہوں نے ہنسی کو ضبط کیا اور کہا: شہزادہ صاحب کیا آپ میرا حکم مانیں گے اور سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی تکلیف گوارہ کریں گے۔ قسمت بیگ نے کہا: ہرگز نہیں' کالج میں استاد کھڑا رہتا ہے اور شاگرد بیٹھے رہتے ہیں۔ تم شاگرد ہو اور میں استاد ہوں' تم سب انجان ہو اور میں دانا ہوں' تم سب بے خبر ہو اور میں خبردار ہوں' تم سب غافل ہو اور میں ہوشیار ہوں' تم سب ادنیٰ ہو اور میں اعلیٰ ہوں' تم سب بڑے ہو اور میں چھوٹا ہو' تم سب امیر ہو اور میں غریب ہوں' تم سب فانی ہو اور میں باقی ہوں' تم سب پانی ہو اور میں بلبلا ہوں' تم سب خاک ہو اور میں ہوا ہوں' تم سب ایندھن ہو اور میں آگ ہوں' تم سب تاریکی ہو اور میں روشنی ہوں'' یہ کہتے کہتے قسمت بیگ نے اپنی دونوں مونچھوں کو دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں سے پکڑا اور اُن کو مروڑا اور اُچھلنا شروع کر دیا۔ اُچھلتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا: میں ہوں' میں ہوں' تم نہیں ہو' میں ہوں' میں ہوں میں' جو کچھ ہے جو کچھ تھا جو کچھ ہو کچھ نہیں ہے' کچھ نہیں ہے' میں ہوں' میں ہوں' پھر سنو' پھر کہوں میں ہوں میں ہوں میں ہوں میں۔

مہاراج اور حاضرین کے جسموں میں رعشہ پڑ گیا اور اُن سب پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ قسمت بیگ کی دیوانہ وار باتوں اور اُچھل کود سے غیر معمولی اثر ہوا۔

کچھ دیر کے بعد قسمت بیگ مہاراج کے قریب خاموش ہو کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے نہایت ناتواں آواز میں کہا: حضور سواری چلی گئی' میں ایک مرکب تھا اور سوار میرا اور تھا' میں ایک ہوٹل تھا اور مہمان کوئی اور تھا' میں ایک بوتل تھا اور شراب کوئی اور تھی' اب سنئے' مجھ بیمار لاچار خانساماں کی کہانی:

بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میری ماں لونڈی تھی اور بادشاہ کی معتوب تھی۔ جب غدر 1857ء کا انقلاب ہوا تو میری عمر دس سال کی تھی۔ بادشاہ نے گھبراہٹ کے وقت اپنے بیوی بچوں کا انتظام بہت اُدھورہ کیا تھا اور اُس وقت میرا اور میری ماں کا شاید اُن کو خیال بھی نہ آیا ہوگا

کیونکہ میری ماں لال قلعہ کے باہر خاص بازار میں ایک مکان میں رہتی تھیں۔ مکان شاہی تھا' پہرہ دار اور نوکر بھی بادشاہ کی طرف سے تھے' خرچ بھی ملتا تھا مگر بادشاہ میری پیدائش سے پہلے ہی ماں سے خفا ہو گئے تھے اور اُنہوں نے کبھی میری صورت نہیں دیکھی' نہ میری ماں کو قلعہ میں بلایا۔

جب دہلی کے سب باشندے بھاگے اور ولسن صاحب کمانڈر کشمیری دروازے سے شہر میں داخل ہوئے تو میری ماں نے مجھ کو اپنے ساتھ لیا اور پیدل گھر سے روانہ ہوئیں۔ نوکر پہلے ہی بھاگ گئے تھے' سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میری والدہ نے سو اشرفیاں اپنے ساتھ لے لیں اور کوئی سامان نہ لیا۔ دہلی سے نکل کر ہم دونوں قدم شریف کی درگاہ میں گئے جو دہلی کی فصیل سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے مگر یہ راستہ بھی ہم کو کئی کوس کا معلوم ہوا کیونکہ نہ مجھے پیدل چلنے کی عادت تھی نہ میری ماں کو۔ مجھے یاد ہے کہ دہلی کے باشندے ایسی گھبراہٹ میں جا رہے تھے کہ گویا قیامت قائم ہے اور سب نفسی نفس کہتے ہوئے خدا کے پاس جا رہے ہیں۔ عورتیں کپڑوں کی بقچیاں سروں پر رکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھ پکڑے جا رہی تھیں۔ بچے رو رہے تھے' وہ اُن کو کھینچتی تھیں اور بچے چل نہ سکتے تھے۔ مردوں کا بھی یہی حال تھا۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ سب اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔

قدم شریف میں جا کر ہم ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں بیٹھ گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ رات ہوئی' مجھے بھوک لگی مگر وہاں کچھ کھانے کو نہ تھا۔ میری ماں نے مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور تسلی دلاسے کی باتیں کرنے لگیں۔ شہر سے بندوقوں کی آوازیں اور شہر والوں کا غل شور سن سن کر میں گھبرایا جاتا تھا اور میری والدہ بھی سہمی بیٹھی تھیں یہاں تک کہ میں اِسی بھوک کی حالت میں سو گیا۔

صبح ہندوستانی فوج کے سپاہی قدم شریف میں آئے اور اُنہوں نے لوگوں کو پکڑنا شروع کیا۔ میری ماں کو بھی گرفتار کر لیا اور ایک پوربیہ ہندو اُن کو اپنے ساتھ پہاڑی پر لے گیا جو قدم شریف سے کئی میل دور تھی اور ہم دونوں جب پہاڑی پر پہنچے تو ہمارے پاؤں خونم خون ہو گئے تھے۔ شام کو ہمیں انگریز افسر کے سامنے پیش کیا گیا اور اُس نے میری ماں سے کچھ سوالات کئے' مجھے یاد نہیں کہ انگریز نے کیا کہا اور میری ماں نے کیا جواب دیا۔ اتنا یاد ہے کہ انگریز کو میری ماں نے بتا دیا کہ وہ بادشاہ کی لونڈی ہے اور بچہ بادشاہ کا بیٹا ہے۔ انگریز افسر نے حکم دیا کہ اِن دونوں کو آرام سے رکھا جائے۔ آرام یہ تھا کہ ہم کو ایک چھوٹا سا خیمہ دے دیا گیا جس میں رات دن پڑے رہتے تھے اور دو وقت کھانا ہم کو مل جاتا تھا۔

جب دہلی میں انگریزی انتظام قائم ہوگیا تو ہم دونوں کو چاندنی محل میں جو جامع مسجد کے قریب ایک محلہ تھا' بھجوا دیا گیا جہاں ہمارے خاندان کے اور لوگ بھی آباد تھے۔ میری والدہ کے نام دس روپے ماہوار گذارہ کے مقرر کر دیئے گئے اور میں نے اپنی والدہ کے ساتھ بچپن سے جوانی تک جیسی جیسی مصیبتیں اُٹھائیں' بس میرا دل ہی جانتا ہے۔

چاندنی محل کے قریب ایک خانقاہ تھی اور میں وہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ خانقاہ میں ایک درویش رہتے تھے' اُن کی باتیں سنتا تھا اور اُن کا مجھ پر بہت اثر ہوتا تھا۔ اُنہی کی باتوں سے مجھے اپنی اور کائنات کے ہر چیز کی حقیقت کا علم ہوا اور اِس وقت جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں' یہ بھی اُنہی کی محبت کا اثر ہے۔

والدہ نے خاندان ہی کے اندر میری شادی بھی کر دی' اولاد بھی ہوئی مگر وہ زندہ نہ رہی۔ میں نے دہلی میں ایک خانساماں کی شاگردی اختیار کی اور یہ کام سیکھا جو اب کر رہا ہوں اور جب میری والدہ اور بیوی کا انتقال ہوگیا تو میں دہلی سے بمبئی چلا آیا اور یہاں مختلف لوگوں کی نوکریاں کیں۔ ہوٹلوں میں بھی رہا اور اب مدت سے تاج محل ہوٹل میں خانساماں ہوں۔

بچپن سے میرے ایک کان میں کچھ خرابی ہوگئی جو آج تک باقی ہے مگر میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی میرے بہرہ پن کو نہ سمجھ سکے کیونکہ مجھے اِس عیب سے بہت شرم آتی ہے۔ میری یہ بات سُن کر مہاراج نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہا: قسمت بیگ نام کس نے رکھا؟

خانساماں نے کہا: میری قسمت نے ورنہ میری ماں نے تو میرا نام تیمور شاہ رکھا تھا مگر میں جب دہلی سے بمبئی آیا تو ہر شخص کو میں نے اپنا نام قسمت بیگ بتایا۔

مہاراج نے کہا: ''چلو میں تم کو بھاؤنگر لے چلوں۔ جو تنخواہ یہاں ملتی ہے' اُس سے دُگنی تنخواہ دوں گا اور فقط تمہاری باتیں سنا کروں گا' کوئی کام نہیں لوں گا''

یہ بات سُن کر قسمت بیگ نے جھک کر تین فرشی سلام مہاراج کو کیئے' پھر کہا: یہ عین بندہ نوازی ہے لیکن جس نے اِس دنیا کے انقلاب کو سمجھ لیا ہے وہ قناعت کے دروازے پر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک دروازہ کو پکڑ اور مضبوط پکڑ' دربدر بھٹکتا نہ پھر۔ اِس ہوٹل میں میری عزت بھی ہے اور میری مزاج داری بھی ہے۔ صاحب لوگ بھی میری بدمزاجیوں کو برداشت کر لیتے ہیں' ضرورت کے موافق ہر چیز موجود ہے۔ آپ ہی فرمایئے کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کیوں کروں اور ایک جگہ کو چھوڑ کر جہاں کوئی تکلیف نہیں ہے' آپ کے ہاں کیوں آؤں؟

مہاراج نے آفرین کہی اور ایک ہزار روپے کا چیک لکھ کر دیا اور کہا کہ اِس کو اپنے خرچ

میں لانا۔ آئندہ بھی ہر سال ہوٹل کے منیجر کی معرفت سے ہزار روپے تم کو مل جایا کریں گے۔ قسمت بیگ نے پھر سلام کیا اور چیک لے کر رونے لگا اور پچھلے قدم ہٹ کر باہر چلا گیا۔ معلوم نہیں اُس کو رونا کیوں آیا اور اُسے کیا بات یاد آگئی۔

☆☆☆☆☆

مرزا مغل کی بیٹی

غدر 1857ء میں جب باغی فوجوں نے بہادر شاہ ظفر کے مضبوط و بہادر لڑکے میرزا مغل کو اپنا کمانڈر انچیف بنالیا اور میرزا مغل عملاً باغیوں کی سرداری کا کام انجام دینے لگے تو ایک دن انچاس انگریز عورت' مرد' بچے اور بوڑھے دہلی کے لال قلعہ میں باغی فوج کی شرارت سے قتل کیے گئے۔ جس وقت اِن انگریز مردوں' عورتوں اور بچوں کو دیوان خاص کے سامنے قتل کرنے کیلئے کھڑا کیا گیا ہے تو مرزا مغل اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے مقتل کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت اُن کی آٹھ برس کی لڑکی نرگس نظر بھی پاس کھڑی تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ انگریزوں کے بچے بھی قتل گاہ میں لا کر کھڑے کیے گئے اور اِن بچوں نے بلبلا بلبلا کر رونا شروع کیا اور اُن کی مائیں گھٹنے ٹیک کر خدا سے دعا مانگنے لگیں اور اُنہوں نے اپنے بچوں کو چھاتی سے لگا کر زار و قطار رونا شروع کیا تو اُس وقت وہ اور کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کی آنکھ سے آنسو جاری نہ ہوں۔ میرزا مغل کے چند مصاحب جو اُن کے پاس کھڑے تھے' خصوصاً اُن کی لڑکی نرگس نظر کے استاد مولانا عین اللہ صاحب آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے: صاحب عالم! یہ تو بڑی سفاکی کا کام ہے۔ عورتوں اور بچوں کا قتل کسی مذہب میں روا نہیں ہے اور اسلام نے تو سختی سے اِس کی ممانعت فرمائی ہے۔ للہ! آپ فوج کو حکم دیجیے کہ وہ اِن عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرے۔ میرزا مغل نے جواب دیا کہ بے شک یہ بڑے ظلم و ستم کی بات ہے مگر فوج کے جاہل سپاہیوں اور غصہ میں بھرے ہوئے افسروں کو روکنا اور اِس برے کام سے باز رکھنا آسان نہیں ہے۔ یہ لوگ بالکل جنگلی اور وحشی ہیں اور انگریزوں سے باغی ہونے کے بعد اتنے خودسر اور بے بہرہ ہوگئے ہیں کہ کسی شخص کا حکم نہیں مانتے' جو جی میں آتا ہے' کرتے ہیں۔

مولانا عین اللہ صاحب نے کہا: صاحب عالم کو تو اُنہوں نے اپنا سپہ سالار بنالیا ہے اور جہاں پناہ ظل سبحانی اعلیٰ حضرت بادشاہ سلامت کو یہ اپنا حکمران تسلیم کر چکے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ

آپ کا یا آپ کے والد بادشاہ سلامت کا حکم نہ مانیں۔ آپ کو اِس بات کی ضرور کوشش کرنی چاہیے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اِن انگریز عورتوں اور بچوں کے رونے اور آہ و زاری کرنے سے آسمان و زمین کانپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مرزا مغل نے جواب دیا: مولانا میں اور میرے والد نام کے کھلونے بنا دیے گئے ہیں ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نہ میرا کوئی کہنا مانتا ہے نہ بادشاہ سلامت کا۔ جب یہ انگریز عورت مرد گرفتار ہوکر آئے تو میں نے اِسی مصلحت کے تحت حضرت بادشاہ سلامت کے پاس بھجوا دیا تھا کہ کسی صورت سے اِن عورتوں اور بچوں کی جان بچالوں مگر اِن ظالم باغیوں نے قلعہ کے اندر بھی اِن بیچارے انگریز مردوں اور عورتوں کو اپنی گرفت کے اندر رکھا اور بادشاہ سلامت کے اثر کو کسی طرح قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ جب میرے کہنے سے دو ایک مرتبہ بادشاہ سلامت نے مکلف کھانے اِن بے کس قیدیوں کو اپنے خاصے سے بھجوانے چاہے تو باغی مزاحم ہوئے اور دقت کے ساتھ اِن قیدیوں کو کھانا دینے پر رضامند ہوئے۔ اُن کا اِس وقت سے یہ خیال ہے کہ بادشاہ سلامت اور اُن کی اولاد انگریزوں سے ملی ہوئی ہے۔ چنانچہ اِن کے اکثر منہ پھٹ سپاہیوں نے میرے اور جہاں پناہ کے منہ در منہ یہ کہا کہ ہم نے اپنی جانوں کو اور سارے گھر بار کو تباہی میں ڈال دیا ہے مگر آپ اِس کی کچھ قدر نہیں کرتے اور بات بات میں انگریزوں کی رعایت کرتے ہیں۔ اگر آپ لوگ اِس سے باز نہ آئے تو پہلے ہم آپ سب لوگوں کا تلوار سے صفایا کردیں گے۔ مولانا! تمہیں انصاف کرو! ایسی جنگلی اور وحشی فوج سے کیوں کر سفارش کی جاسکتی ہے۔ اگر اِس وقت میں اِن لوگوں کو عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع کروں تو یہ پہلے مجھ کو اور میرے بچوں کو اِسی مقام پر لے جا کر قتل کردیں گے جہاں اِن بیچارے انگریز قیدیوں کو ہلاکت کے ارادے سے لے کر گئے ہیں۔

مولانا عین اللہ صاحب نے فرمایا کہ صاحب عالم کی یہ مجبوری حق بجانب ہے مگر اسلام حکم دیتا ہے کہ مظلوم کی حمایت کیلئے اپنی جان تک کی بھی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے۔ دنیا چند روزہ ہے۔ چلیے میرے ساتھ چلیے۔ میں خود جا کر اِن باغیوں کو نصیحت کروں گا۔ مرزا مغل نے اِس کا جواب تو نہ دیا مگر اُن کے چہرے کے تذبذب اور سکوت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس خیال پر کچھ آمادہ ہونا چاہتے ہیں۔ مگر قبل اِس کے کہ وہ ایک لفظ اپنی زبان سے نکالتے' ایک شخص نے جو مرزا کے مصاحبوں کے پیچھے کھڑا ہوا تھا' دوڑ کر مولانا عین اللہ صاحب کی پیٹھ میں ایک چھری ماری اور اُلٹے قدموں یہ کہتا ہوا بھاگا کہ کافروں اور کافروں کے دوستوں کی یہ سزا ہے۔ مرزا مغل کے مصاحب

اور خود مرزا مغل مولانا عین اللہ کو سنبھالنے لگے اور دو ایک آدمی قاتل کے پیچھے دوڑے تاکہ اُس کو گرفتار کریں مگر قاتل کوٹھے سے اُتر کر نیچے دوڑتا ہوا باغی سپاہیوں کے جھرمٹ میں جا کر چھپ گیا۔

چھری مولانا عین اللہ کے بائیں پہلو پر لگی تھی جس نے پسلیوں کو چیر کر گردوں کے دو ٹکڑے کر دیئے اور بیچارے مولانا گرتے ہی رحلت کر گئے اور ایک بات بھی اُن کے منہ سے نہ نکلنے پائی۔

نرگس نظر کو بچی تھی مگر اپنے استاد کا یہ حال دیکھ کر پہلے تو کچھ خوفزدہ ہوگئی اور اُس کے بعد ہائے مولوی صاحب کہہ کر رونا شروع کیا۔

(2)

باغی فوجیں بھاگ گئیں۔ انگریزی فوج نے دہلی فتح کر لی۔ بہادر شاہ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہوگئے۔ مرزا مغل، مرزا ابوبکر وغیرہ فاتح فوج کے ہاتھوں اسیر ہو کر قتل کر دیئے گئے۔ اُس وقت نرگس نظر اپنی والدہ کے ساتھ جو مرزا مغل کی ایک منظورِ نظر لونڈی تھی، بیل گاڑی میں سوار جنگل میں جا رہی تھی۔ گاڑی میں ایک نرگس نظر، ایک اُس کی ماں اور ایک خانم نام کی ماما کل تین عورتیں تھیں اور دو مرد۔ مردوں میں ایک مرزا گھسیٹا تھے جن کی دور کی قرابت شاہ عالم بادشاہ سے ہوتی تھی اور دوسرے میرزا مغل کی ڈیوڑھی کے داروغہ قدرت خاں تھے۔ گاڑی قطب صاحب کی درگاہ سے آگے بڑھ کر چھتر پور کے قریب پہنچی تھی کہ سامنے سے چند سوار آتے نظر آئے۔ اِن لوگوں نے سمجھا کہ انگریزی فوج آ گئی، اِس واسطے اُنہوں نے گاڑی کو راستہ سے بالکل ہٹا لیا اور چاہا کہ درختوں کی آڑ میں چھپ جائیں مگر گاڑی دس قدم بھی آگے بڑھنے نہ پائی تھی کہ سوار قریب پہنچ گئے اور اُنہوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ نرگس نظر نے دیکھا کہ اِن سواروں میں وہ شخص بھی ہے جس نے مولانا عین اللہ کو شہید کیا تھا۔ اُس وقت اُس نے چپکے سے اپنی ماں کے کان میں کہا، یہ انگریزی فوج نہیں ہے بلکہ باغی فوج ہے۔ سواروں نے گاڑی کو روک لیا اور کہا کہ جو کچھ مال تمہارے پاس ہو ہمیں دے دو۔ مرزا گھسیٹا نے ایک باغی سپاہی کو پہچان کر کہا کہ تم کو تو ہماری مدد کرنی چاہیے نہ کہ اُلٹا ہم کو لوٹو۔ اِس پر مولانا عین اللہ کے قاتل نے کہا، تم لوگ مدد کے قابل نہیں ہو کیونکہ تمہاری مخبریوں نے انگریزوں کو فتح دلوائی اور ہم کو بھاگنا پڑا۔ داروغہ قدرت خاں نے جواب دیا بالکل جھوٹ ہے۔ تمہیں لوگوں نے ہماری اطاعت نہ کی اور اتنی بڑی طاقت کے باوجود

بھاگ کھڑے ہوئے اور ہمارا عیش و آرام اور گھر بار برباد کر دیا۔ یہ فقرہ سُن کر باغی بے تاب ہو گئے اور غضبناک ہو کر اُنہوں نے گاڑی بان اور مردوں پر تلواریں مارنی شروع کیں۔ چنانچہ مرزا گھسیٹا، داروغہ قدرت خاں اور گاڑی بان اِسی جگہ مارے گئے اور بیچاری خانم بھی قدرت خاں کے بچانے میں تلوار کھا کر گر پڑی اور جان سے گئی۔ صرف نرگس نظر اور اُس کی ماں زندہ بچیں۔ باغیوں نے گاڑی کا سب اسباب لوٹ لیا یہاں تک کہ مقتولوں کے کپڑے بھی اُتار لیے۔ نرگس نظر کی والدہ کے پاس جتنا زیور تھا، وہ بھی چھین لیا اور نرگس نظر کے کانوں میں اور گلے میں جو زیور تھا، وہ بھی زبردستی اُتار لیا۔ اِس کے بعد وہ آپس میں مشورے کرنے لگے کہ اِن دونوں کو کون لے۔ ایک سوار نے کہا، عورت جوان ہے، اِس سے میں شادی کروں گا، اِس کو مجھے دے دو اور اِس کے عوض میں میرے حصے کا زیور لے لو۔ مولانا عین اللہ کا قاتل بولا، اِس لڑکی کو میں لوں گا کیونکہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔ چنانچہ اِس مشورے پر عمل کیا گیا اور نرگس نظر کی والدہ کو ایک سوار نے اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور نرگس نظر کو مولانا عین اللہ کے قاتل نے اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا۔ نرگس نظر "اماں اماں" کہہ کر رونے لگی تو نرگس نظر کی والدہ نے اُس سوار سے کہا کہ میری لڑکی کو بھی تو لے لے تاکہ ہم دونوں ایک جگہ رہیں۔ اِس سوار نے کہا کہ میں بھرت پور کا رہنے والا ہوں اور وہاں تجھ کو لے کر جاؤں گا اور یہ سوار جس کے حصے میں تیری لڑکی آئی ہے، سوہنہ ضلع گوڑگانوہ کا رہنے والا ہے۔ ہم آپس کی تقسیم کو بدلنا نہیں چاہتے۔ نرگس نظر کی والدہ نے کہا، اللہ مجھ پر رحم کرے اور میری اکلوتی بچی کو مجھ سے نہ چھڑاؤ، مگر اِن ظالموں کو ذرا بھی رحم نہ آیا اور بھرت پوری سوار نرگس نظر کی والدہ کو لے کر بھرت پور چلا گیا اور مولانا عین اللہ کا قاتل نرگس کو لئے سوہنہ پہنچ گیا۔

(3)

نرگس نظر کا بیان ہے کہ جب میری والدہ مجھ سے جدا ہو کر چلیں تو وہ اپنے بال نوچتی تھیں اور دھاڑیں مار مار کر روتی تھیں اور میں بھی "اماں اماں" کہہ کر چیختی تھی مگر اِن کو ہم میں سے کسی کی فریاد پر رحم نہیں آتا تھا۔ مجھ کو جب تک اماں کا گھوڑا نظر آتا رہا، اُن کو چیخ چیخ کر پکارتی رہی لیکن جب گھوڑا آنکھوں سے اُوجھل ہو گیا تو میں چپ ہوگئی۔ سوہنہ میں پہنچ کر وہ شخص مجھ کو اپنے مکان میں لے گیا۔ وہ ذات کا گھوسی تھا۔ اُس کے گھر میں تین چار بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ اُس کی بیوی نے جب مجھ کو دیکھا اور خاوند سے یہ سنا کہ وہ مجھ کو بیٹی بنانے کیلئے لایا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی اور اُس نے مجھ کو بہت پیار و محبت سے اپنے پاس بٹھایا۔ آٹھ دن تک اُس گھوسن نے میری ایسی خاطر

کی کہ میں اپنی ماں کی جدائی کے غم کو بھول گئی۔ آٹھ دن کے بعد یکا یک انگریزی فوج آئی اور اُس نے میرے موجودہ باپ کو پکڑ لیا اور گھر کا تمام مال واسباب ضبط کر کے لے گئی۔ مجھ کو میری گھوسن ماں نے بہت تسلی دی اور پڑوس کے ایک شخص کے ہاں چلی گئی۔ تین روز کے بعد ہم نے سنا کہ وہ گھوسی بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور اُس کا تمام مال واسباب نیلام ہو گیا۔ بیچاری گھوسن بھاگتے وقت کچھ نقدی اپنے ساتھ لے گئی تھی جس سے وہ دو سال تک اپنا گذارہ کرتی رہی اور میری دلداری میں اُس نے کسی قسم کی کمی نہ کی۔

ایک روز رات کو ہمارے گھر میں چور آئے اور اُنہوں نے میری گھوسن ماں کے گلے سے ہنسلی اُتارنی چاہی۔ گھوسن کی ماں کی آنکھ کھل گئی اور اُس نے غل مچا دیا۔ اِس پر چوروں نے گھوسن ماں کا گلہ گھونٹ ڈالا اور وہ بیچاری اِس صدمہ سے مر گئی۔

گھوسن ماں کے مرنے کے بعد ایک دو دن تک مکان والوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا بلکہ تسلی تشفی سے پیش آتے رہے مگر تین دن کے بعد اُس مکان والے کی بیوی نے کہا: اری تو دن بھر بیٹھی رہتی ہے' کچھ کام کیوں نہیں کرتی' ہمارے ہاں مفت کی روٹی نہیں ہے۔ خدمت کرے گی تو کھانے کو ملے گا۔ میں نے کہا: مجھے کام بتاؤ' تم جو کہو گی میں وہی کروں گی۔ اُس عورت نے کہا: گھر میں جھاڑو دیا کر' بھینسوں کا گوبر اُٹھایا کر اور اُن کے اُپلے تھاپا کر۔

میں نے جواب دیا: اُپلے تھاپنے مجھ کو نہیں آتے' جھاڑو میں نے کبھی نہیں دی' یہ کام میں نے کبھی نہیں کیئے۔ میں ہندوستان کے بادشاہ کی پوتی ہوں مگر خدا نے یہ وقت مجھ پر ڈالا ہے' تو جو کام تم کہو گی وہی کروں گی۔ دو چار دفعہ مجھ کو یہ کام کر کے بتاؤ تا کہ میں سیکھ جاؤں۔ وہ عورت بڑی نرم مزاج تھی۔ اُس نے جھاڑو دینی اور اُپلے تھاپنے سکھا دیئے اور میں یہ کام کرنے لگی۔ ایک دن مجھ کو شدت کا بخار تھا اور اُس کی تکلیف کے سبب مجھ سے اُپلے نہ تھاپے گئے۔ اُس عورت کا خاوند گھر میں آیا اور مجھ کو پڑا ہوا دیکھا تو اُس نے میرے ایک ٹھوکر ماری اور کہا: دس بج گئے تو اب تک پڑی سوتی ہے' یہ لال قلعہ نہیں ہے' گھوسی کا گھر ہے۔ اُٹھ کر بیٹھ اور گوبر تھاپ۔

گھوسی کے ٹھوکر مارنے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اُٹھ بیٹھی اور کہا: مجھ سے خطا ہو گئی' میں ابھی گوبر تھاپتی ہوں۔ چنانچہ میں نے اِسی بخار کی حالت میں جھاڑو بھی دی اور اُپلے بھی تھاپے۔ اُس وقت تو مجھے اتنی سمجھ نہ تھی مگر آج جب مجھے اِس مصیبت کا دھیان آتا ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ اِن کم بخت ظالم باغیوں کی بدولت ہم لوگوں کو کیسی کیسی پتا

سہنی پڑی۔ ہم اُس محل کے رہنے والے تھے جس کے اندر کا تصور شاعروں سے عجیب وغریب نظمیں لکھواتا تھا اور جہاں یہ شعر لکھا ہوا تھا:

اگر زمیں پر کہیں بہشت ہے
تو وہ یہی ہے' یہی ہے

مگر مصیبت نے یہ دن دکھا دیا کہ ہم محلوں سے نکل کر در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے اور اُپلے تھاپتے تھے۔ دو سال اِسی مصیبت میں گزرے۔ آخر میں گھوسی نے اپنے بھائی کے ساتھ میری شادی کر دی جہاں میری ساری عمر بسر ہوئی۔

میں نے گھوسیوں کی زندگی میں جان بوجھ کر کبھی قلعہ اور اُس کی بادشاہی کا خیال نہیں کیا' مگر میں مجبور تھی کہ دل ہر روز بچپن کا وقت یاد دلاتا تھا اور سوتے میں بھی دیکھا کرتی تھی کہ میرے والد مرزا مغل مسند پر بیٹھے ہیں' میں اُن کے زانو پر سر رکھی لیٹی ہوں۔ لونڈیاں چنور ہلا رہی ہیں اور دنیا مجھ کو بہشت کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب آنکھ کھلتی تھی تو ٹوٹے ہوئے چھپر' ایک چکی' ایک چرخہ اور تین چار پائیوں کے سوا گھر میں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کیا تم مرزا مغل کی بیٹی نرگس نظر ہو؟ تو میں صاف کہہ دوں گی کہ نہیں' میں تو ایک غریب گھوسن ہوں کیونکہ آدمی کی ذات وہی کہ جس ذات کے کام کرتا ہو۔

☆☆☆☆☆

نرگس نظر کی مصیبت

شہزادی نرگس نظر میرزا شاہ رخ ابن بہادر بادشاہ کی بیٹی تھی۔ غدر 1857ء میں اُن کی عمر سترہ سال کی تھی۔

موجودہ لال قلعہ دہلی میں دیوان خاص اور موتی مسجد کے غرب میں اور گورہ بارگ کے شرق میں ایک سنگین تالاب ہے جس کے وسط میں ایک خوبصورت محل بنا ہوا اور اُس کے شمال سے نہر آتی ہے۔ سنگ مرمر کی جھلملیاں اور چراغ دان بنے ہوءے ہیں۔ ان پر سے نہر کا پانی گزرتا ہوا اِس تالاب میں آتا تھا۔ میرزا شاہ رخ بہادر اِسی جل محل میں رہتے تھے۔ اُن کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اِس لئے میرزا صاحب کو اپنی بیٹی نرگس نظر سے بہت ہی محبت تھی۔

جل محل کو کشمیری شالوں اور رومی قالینوں اور بناری کپڑوں سے خوب ہی آراستہ کیا گیا تھا۔ نرگس نظر کی طبیعت میں نفاست ونزاکت وسلیقہ مندی بہت زیادہ تھی۔ اُن کا محل سارے قلعہ میں سب حویلیوں اور محلات سے زیادہ خوبصورت اور آراستہ سمجھا جاتا تھا۔

نرگس نظر کا نظام اوقات یہ تھا کہ وہ صبح سورج نکلنے کے بعد بیدار ہوتی تھیں۔ گرمی کے موسم میں اُن کا چھپر کٹ صحن میں بچھایا جاتا تھا جہاں سنگ مرمر کا فرش تھا۔ چھپر کٹ کے پائے اور ڈنڈے سونے کے تھے اور اُن پر نگینے جڑے ہوئے تھے۔ خوبصورت ریشمی کپڑے کے مسہری تھی۔ اندر ریشمی تکیے رکھے رہتے تھے۔ چار نازک نازک نرم نرم تکیے سرہانے ہوتے تھے اور سرہانے کے تکیوں کے پاس دو چھوٹے گول گول تکیے اور ہوتے تھے' جن کو گال (گل) تکیہ کہا جاتا تھا۔ یہ تکیے رخسار کی ٹیک کیلئے تھے کہ اگر شہزادی کا سر تکیوں سے نیچے آجائے تو گل تکیے اُن کے رخسار کو تکلیف سے بچالیں۔

دو تکیے ذرا بڑے بڑے دونوں پہلوؤں میں ہوتے تھے کہ اُن سے شہزادی صاحبہ اپنے گھٹنے کو سہارا دے سکیں۔ رات کو جب نرگس نظر مسہری کے اندر جاتی تھی تو مولسری اور جوئی اور چمپا کے

پھول اُن کے گل تکیوں کے پاس رکھے جاتے تھے کہ رات کو اُن کی خوشبو شہزادی کو مسرور کرتی رہے۔

جوں ہی نرگس نظر مسہری میں گئیں' چار ناچنے والی چھوکریاں آجاتی تھیں اور ہلکے سروں میں گاتی تھیں' جب شہزادی کو نیند آتی تھی۔

صبح کو بھی سورج نکلنے سے پہلے یہ ناچنے والی لڑکیاں مسہری کے قریب آکر گاتی تھیں اور اُن کی سریلی آوازوں کو سُن کر شہزادی صاحبہ بیدار ہوتی تھیں۔

شہزادی بیدار ہونے کے بعد مسہری کے اندر بیٹھ جاتیں اور دیر تک جمائیاں لیتیں' انگڑائیاں لیتیں اور گانے والی لڑکیاں اُن سے ہنسی کی باتیں کرتیں۔

ایک کہتی: اے حضور! جمائی آتی ہے' رومال حاضر کروں' منہ کو ڈھک لیجیے۔

دوسری کہتی: سرکار کی انگڑائیاں دیکھنے کو تالاب کی مچھلیاں بے تاب ہو کر پانی کے چہرہ پر چلی آرہی ہیں۔ نرگس نظر آنکھیں مل کر اور مسکرا کر کہتیں: چل دور' موئی مردار کیسی جھوٹی باتیں بناتی ہے' تو چھوکری کہتی: میں جھوٹ کہتی ہوں یا سچ آئینے سے پوچھ لیجیے' وہ بھی تو سامنے آپ کو دیکھ رہا ہے' اُس کے اندر بھی تو بال بکھر رہے ہیں' وہ بھی تو مہندی لگی لال لال انگلیاں اُونچی کر کے سرکار کی انگڑائی کی تعریف کر رہا ہے' وہاں بھی تو ایک مستی کا عالم نظر آتا ہے۔

تیسری کہتی: آفتاب کی کرنیں لال لال بادلوں سے ایسی نکلیں جیسے سرکار کے لال لال ہونٹوں سے سفید سفید دانت' اور یہ رخسار تو صبح صادق کا نور ہیں' بال بکھر کر جو چہرہ پر آئے ہیں' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چودھویں رات کے چاند پر کالے بادل چھائے ہوئے چلے آتے ہیں مگر چاند سے مات ہو کر اُن کا کلیجہ شق ہو گیا ہے اور چاند کے چاروں طرف اپنے کلیجہ کے ٹکڑوں کو بکھیر دیا ہے۔

نرگس نظر یہ سُن کر مسکراتی ہوئی مسہری سے باہر آتیں' طشت چوکی پر جاتیں' پھر باہر آکر کھلی اور بیسن سے منہ ہاتھ دھوتیں۔ پھر جوڑا بدلا جاتا' ناشتہ کیا جاتا۔ اِس کے بعد گھر کی آرائش کو خود جا کر دیکھتیں اور نئی نئی ایجادوں چیزوں کے سنوارنے میں ہوتیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر گانا ہوتا' شام کو چمن میں گل گشت کا معمول پورا کیا جاتا۔ رات کے کھانے میں بڑی بہار ہوتی۔ باجے بج رہے ہیں' گانے ہو رہے ہیں اور مصاحب لڑکیوں کے ساتھ کھانا کھایا جا رہا ہے۔

قلعہ کی آخری رات

[illegible] لال قلعہ سے نکل کر [illegible] کے مقبرہ میں گئے اور یقین ہو گیا کہ

صبح انگریز دہلی کو مفتوح کرلیں گے تو نرگس نظر چپ چاپ جل محل کے کنارے پر کھڑی چاندنی کو دیکھ رہی تھی۔ اُن کا عکس تالاب میں پڑ رہا تھا اور اُن پر اپنی دید کا ایک عجب عالم محویت طاری تھا۔

یکا یک اُن کے باپ میرزا شاہ رخ اندر آئے اور اُنہوں نے کہا: نرگس بیٹا! میں ابا حضرت (بہادر شاہ) کے ہمراہ جانا چاہتا ہوں۔ تم ابھی چلوں گی یا سواری کا بندوبست کردوں، صبح آجانا۔ نرگس نظر نے کہا: ابا جان! آپ بھی ابھی نہ جایئے۔ پچھلی رات میرے ساتھ چلئے گا، میں دادا حضرت کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھتی۔ انگریزی فوج اُنہی کی تلاش کرے گی اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہوں گے، وہ سب مجرم سمجھے جائیں گے، اِس لئے ہمایوں کے مقبرہ میں دادا حضرت کے ساتھ جانا ٹھیک نہیں ہے۔ غازی آباد میں چلئے، وہاں میری انا کا گھر ہے اور سنا ہے بہت اچھی اور محفوظ جگہ ہے۔ گمنامی اختیار کرکے چلنا چاہیے۔ جب یہ بلا دور ہوجائے گی تو پھر یہاں آجائیں گے۔

میرزا شاہ رخ نے کہا: اچھا جیسی تمہاری رائے۔ میں غازی نگر جانے کیلئے رتھوں کا بندوبست کرتا ہوں، تمہارے ساتھ کون کون جائے گا؟

نرگس نظر نے جواب دیا: کوئی نہیں، صرف اکیلی چلوں گی کیونکہ نوکروں کا ساتھ رکھنا بھی نامناسب ہے اور نوکر ساتھ جانے کیلئے تیار بھی نہیں معلوم ہوتے۔ میرزا شاہ رخ یہ سُن کر باہر چلے گئے اور نرگس نظر پھر ماہتاب اور عالم آب کو دیکھنے لگیں۔

کچھ دیر کے بعد نرگس نظر نے نوکر عورتوں کو آواز دی مگر کسی نے جواب نہ دیا، معلوم ہوا کہ سب بھاگ گئے اور نرگس نظر سارے جل محل میں اکیلی ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نرگس نظر نے حاکمانہ آواز دی اور جواب میں کوئی بھی نہ بولا۔ نرگس نظر کو اندر ڈر لگا اور وہ پھر باہر صحن میں آگئیں۔ قلعہ میں جگہ جگہ سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے گھروں کے رہنے والے نکل نکل کر جارہے ہیں۔ نرگس نظر نے بہت دیر باپ کی راہ دیکھی مگر وہ نہ آئے اور نرگس نظر گھبرا کر رونے لگیں۔ رات کے دو بجے ایک خواجہ سرا محل میں آیا اور اُس نے کہا: صاحب عالم (میرزا شاہ رخ) نے فرمایا ہے کہ انگریزی جاسوس میری تلاش میں قلعہ کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، میں تمہارے ساتھ غازی نگر نہیں جاسکتا۔ سواری کا انتظام کردیا ہے، تم خواجہ سرا کے ساتھ چلی جاؤ اور میں بھیس بدل کر کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ نرگس نظر نے گھبرا کر کہا: آخر کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ خواجہ سرا بولا: مجھے معلوم نہیں۔ نرگس نظر نے حاکمانہ لہجہ میں کہا: جا، یہ معلوم کرکے آ کہ ابا حضرت کہاں جانے والے ہیں،

وہ لباس بدل کر میرے ساتھ غازی نگر کیوں نہیں چلتے؟

خواجہ سرا فوراً واپس آیا اور نرگس نظر صحن میں ٹہلتی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد خواجہ سرا واپس آیا اور اُس نے کہا: ابا حضرت سائیں کے کپڑے پہن کر قلعہ سے باہر چلے گئے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ کہاں چلے گئے اور آپ کی سواری کیلئے رتھ تیاری ہے۔ نرگس نظر کو رونا آگیا اور اُن کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اُنہوں نے نہایت بے کسی اور بے بسی کی حالت میں ہچکیاں لے لے کر آنسو بہائے۔ اُنہوں نے جواہرات اور زیورات کا صندوقچہ اور چند ضروری کپڑے ساتھ لئے جن کو خواجہ سرا نے اُٹھالیا اور جل محل سے نکلیں اور سوار ہونے سے پہلے مڑ کر جل محل اور اُس کا آرائش کو بہت دیر تک کھڑے ہوکر دیکھا، پھر کہا: ”خبر نہیں تجھ کو پھر دیکھنا نصیب ہوگا یا آج تو ہمیشہ کیلئے مجھ سے جدا ہو رہا ہے“

رات کے تین بج چکے تھے۔ نرگس نظر رتھ میں بیٹھی غازی نگر (غازی آباد) کی طرف جارہی تھیں۔ صبح آٹھ بجے غازی آباد پہنچ گئیں۔ راستہ میں اُن کو بہت لوگ آتے جاتے ملے مگر کسی نے رتھ کی مزاحمت نہ کی۔ غازی آباد میں نرگس نظر کی انا کا گھر مشہور تھا۔ جوں ہی نرگس نظر انا کے گھر کے سامنے رتھ سے اُتریں، انا دوڑتی ہوئی گھر کے باہر آگئی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے شہزادی کی بلائیں لیں اور اندر لے جا کر بٹھایا اور اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کی۔

پہلی مصیبت

نرگس نظر دو تین روز انا کے گھر میں آرام سے رہیں۔ یکا یک خبر مشہور ہوئی کہ بادشاہ گرفتار ہوگئے اور کئی شہزادے قتل کردیئے گئے اور فوج غازی آباد لوٹنے آرہی ہے۔ نرگس نظر نے جواہرات کا صندوقچہ انا سے کہہ کر زمین میں دفن کرادیا اور مصیبت کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں سکھ فوج غازی آباد میں داخل ہوئی اور اُس نے باغیوں کی تلاش کرنی شروع کردی۔ مخبروں نے کہا: بادشاہ کی پوتی انا کے گھر میں موجود ہے۔ دو سکھ سردار چار سپاہیوں کے ساتھ انا کے گھر میں آئے اور اُنہوں نے انا اور سب گھر والوں کو پکڑ لیا۔ نرگس نظر کوٹھری میں چھپ گئی تھیں، اُن کو بھی کواڑ توڑ کر باہر نکالا گیا اور بے پردہ سامنے کھڑا کیا گیا۔ سردار نے پوچھا: کیا تم بہادر شاہ کی پوتی ہو؟ نرگس نظر نے کہا: میں ایک آدمی کی بیٹی ہوں، بادشاہ کی اولاد ہوتی تو اِس غریب گھر میں کیوں آتی اور اگر خدا نے بادشاہ کی پوتی بنایا ہوتا تو تم اِس طرح بے پردہ مجھ کو سامنے کھڑا نہ کرتے۔ تم ہندوستانی ہو، تم کو شرم نہیں آتی کہ اپنے ملک کی عورتوں پر ظلم کرتے ہو۔ سردار نے کہا: ہم نے کیا ظلم کیا، ہم تو یہ دریافت کرتے ہیں کہ تم کون ہو؟ ہم نے سنا ہے کہ تم بہادر شاہ کی

پوتی ہو اور تمہارے باپ نے بہت سے انگریزوں اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو قلعہ کے اندر قتل کیا تھا۔ نرگس نظر نے کہا: جو کرتا ہے وہی بھرتا ہے۔ اگر میرے باپ نے ایسا کیا ہو گا تو اُن سے پوچھو میں نے کوئی جرم نہیں کیا' میں نے کسی کو نہیں مارا۔ یہ سن کر دوسرا نوجوان سکھ سردار بولا: ہاں تم تو آنکھوں سے قتل کرتی ہو۔ تم کو تلوار اور ہتھیاروں سے مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ نرگس نظر نے نہایت جرات کے ساتھ جواب دیا حالانکہ اُس کی زندگی میں غیر مردوں سے بات کرنے کا یہ پہلا موقع تھا: خاموش رہو! بادشاہوں سے ایسی بے تمیزی کے ساتھ باتیں نہیں کرتے۔ تمہاری زبان گدی کے پیچھے سے نکال لی جائے گی۔ نوجوان سردار یہ سُن کر بگڑا اور اُس نے آگے بڑھ کر نرگس نظر کے بال پکڑ لئے اور اُن کو زور سے جھٹکا دیا۔ بوڑھے سکھ سردار نے نوجوان سردار کو روکا اور کہا: عورت کے ساتھ ایسی زیادتی کرنا مناسب نہیں ہے۔ نوجوان سردار نے یہ سُن کر بال چھوڑ دیئے۔

کرایہ کی ایک بیل گاڑی منگوائی گئی اور اِس میں نرگس نظر کو سوار کیا گیا۔ انا اور اُس کے گھر والے بھی سب قید ہو کر پیدل چلے۔ نرگس نظر سے پوچھا گیا: تمہارا زیور اور روپیہ پیسہ کہاں ہے؟ اُنہوں نے کہا: میں خود ہی زیور ہوں اور خود ہی سمجھنے والوں کیلئے جواہر اور دولت ہوں' میرے پاس اور کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ سُن کر دونوں سردار خاموش ہو گئے اور دہلی کی طرف لے چلے۔

ہنڈن ندی کے پاس گاؤں کے جاٹوں اور گوجروں نے سکھ فوج پر بندوقیں چلائیں اور دیر تک اُن کی آپس میں لڑائی ہوتی رہی۔ سکھ تھوڑے تھے اور گاؤں والے زیادہ۔ سکھ سب مارے گئے اور گاؤں والے قیدیوں کو اپنے ساتھ گاؤں میں لے گئے۔

گنواروں نے نرگس نظر کے جسم پر جو دو چار قیمتی زیور تھے' اُن کو اُتار لیا اور قیمتی کپڑے بھی اُتروا لئے اور کسی چماری کا ایک پھٹا ہوا لہنگا اور پھٹا ہوا کرتہ اور میلا دوپٹہ پہننے کو دے دیا۔ نرگس نظر نے رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا اور مجبوراً تن ڈھکنے کو یہ کپڑے پہنے۔ تھوڑی دیر میں پاس کے گاؤں سے چند مسلمان گنوار آئے اور اُن کے نمبردار نے نرگس نظر کو گوجروں سے خرید لیا اور اپنے گاؤں میں لے گیا۔ یہ لوگ ذات کے رانگھڑ تھے اور کچھ لوگ تگا قوم کے مسلمان تھے۔ نمبردار نے اپنے لڑکے کا پیغام دیا کہ تیری شادی اُس کے ساتھ کر دیں۔ یہ بڈھا آدمی تھا اور اُس کا لڑکا اگرچہ گنوار تھا لیکن صورت شکل کا اچھا تھا۔ نرگس نظر نے ہاں کر لی اور گاؤں کے قاضی نے اُس کا نکاح پڑھا دیا اور نرگس نظر تین چار مہینے نمبردار کے گھر میں نئی دولہن بنی آرام سے بسر اوقات کرتی رہی۔

دوسری مصیبت

انگریزوں کا قبضہ پوری طرح ہو گیا تھا اور اُن کے جاسوس جگہ جگہ خبریں لیتے ہوئے پھر رہے تھے۔ کسی جاسوس نے دہلی کے حاکم کو یہ خبر دی کہ میرزا شاہ رخ باغی دستیاب نہیں ہوئے مگر اُن کی بیٹی فلاں گاؤں میں فلاں نمبردار کے گھر میں موجود ہے۔ انگریز حاکم نے اِس گاؤں میں پولیس کو بھیجا۔ میرٹھ کی پولیس نے آ کر گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور نرگس نظر اور اُن کے خاوند اور سسر کو گرفتار کر کے دہلی میں لایا گیا۔ حاکم نے نرگس نظر سے میرزا شاہ رخ کے متعلق بہت سے سوالات کئے مگر جب کوئی مفید طلب جواب نہ ملا تو حکم دیا کہ نمبردار اور اُس کا بیٹا معلوم ہوتے ہیں اور اِن دونوں نے ایک باغی کی بیٹی کو پناہ دی ہے۔ اِس واسطے اِن دونوں کو جیل بھیج جائے اور یہ عورت دہلی میں کسی مسلمان کے حوالے کر دی جائے۔ چنانچہ نمبردار اور اُس کا بیٹا دس سال کیلئے جیل بھیج دیئے گئے اور نرگس نظر سے پوچھا گیا کہ وہ کس کے ہاں رہنا چاہتی ہے۔ شہزادی نے جواب دیا کہ میرے خاندان کے آدمی دہلی میں ہیں تو اُن کے پاس بھیج دیا جائے۔ معلوم ہوا کہ تیموریہ خاندان کے لوگ ابھی تک یا تو روپوش ہیں یا جنگلوں اور دیہاتوں میں مقیم ہیں۔ دہلی شہر میں ابھی کوئی نہیں آیا' اِس واسطے نرگس نظر ایک فوجی سپاہی کے حوالے کر دی گئیں جو اُس کو اپنے گھر میں لے گیا۔ سپاہی کی بیوی موجود تھی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک قبول صورت جوان عورت گھر میں آئی ہے تو اُس نے دو ہتڑ اپنے خاوند کے مارا اور نرگس نظر کو بھی دھکا دے گھر سے باہر نکال دیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ نرگس نظر کو کسی نے دھکا دیا۔ سپاہی گھر سے باہر آیا اور نرگس نظر کو ساتھ لے کر اپنے ایک دوست کے ہاں لے گیا۔ وہ بڑی عمر کے مسلمان تھے اور گھر میں اکیلے رہتے تھے۔ اُنہوں نے شہزادی کا حال سنا تو رونے لگے اور بہت محبت کے ساتھ اپنے گھر میں جگہ دی اور نرگس نظر ایک رات آرام سے اِس گھر میں رہیں۔

دوسری رات نرگس نظر سوتی تھیں کہ چند آدمیوں نے اُن کا منہ اپنے ہاتھوں سے بند کیا اور اُٹھا کر کہیں لے گے۔ نرگس نظر نے ہر چند ہاتھ پاؤں مارے مگر اُنہوں نے ایسا مضبوط پکڑا تھا کہ یہ جنبش نہ کر سکیں۔ وہ لوگ اِسی گاؤں کے رہنے والے تھے جہاں کے نمبردار کے بیٹے سے نرگس نظر کا نکاح ہوا تھا مگر وہ دہلی کے قریب ایک گاؤں میں لے گئے اور وہاں ایک چھپر میں ٹھہرایا اور ایک چارپائی سونے کیلئے دے دی۔ یہ گاؤں بھی تگا مسلمانوں کا تھا۔

نرگس نظر جس گھر میں رہتی تھیں' وہ نمبردار کا تھا اور نمبردار بہت نیک چلن آدمی تھا۔ تین چار سال تک نرگس نظر اِس گھر میں رہیں۔ وہ سارے گھر کا کام کرتی تھی لیکن گوبر تھاپنا اور دودھ دوہنا

اُن کو نہ آتا تھا۔

چار سال کے بعد اُن کا خاوند رہا ہو گیا اور وقت سے پہلے گورنمنٹ نے اُس کو رہائی دے دی اور وہ نرگس نظر کو اُس گاؤں سے اپنے گھر لے گیا جہاں ساری عمر اُنہوں نے گزاری دی اور اُن کے کئی بچے ہوئے اور 1911ء میں نرگس نظر کا انتقال ہو گیا۔

مصیبت کی ایک رات

نرگس نظر کہتی تھیں کہ جب میں دہلی کے قریب ایک نمبردار کے مکان میں رہتی تھی' اُس زمانہ کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم تھا اور مجھے بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ رات کے وقت بادل گرج رہے تھے' بجلی چمک رہی تھی اور میں اکیلی اپنے چھپر میں گاڑھے کی ایک میلی چادر اُوڑھے کھری چارپائی پر لیٹی تھی۔ خواب میں دیکھا کہ گویا میں جل محل میں سونے جڑاؤ چھپر کھٹ کے اندر لیٹی ہوں۔ جوئی اور چمپا اور مولسری کے پھول اور ریشمی تکیے میرے پاس ہیں اور گانے والی لڑکیاں دھیمے سروں میں گا رہی ہیں اور مجھے عجیب لطف آ رہا ہے۔ اِسی خواب کی حالت میں' میں نے ایک گانے والی کو آواز دی کہ مسہری کا پردہ اُٹھا اور مجھ کو سہارا دے کر بٹھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ دوڑی ہوئی آئی اور اُس نے مجھے گود میں لے کر اُٹھایا اور اُٹھانے میں شوخی سے ذرا مجھ کو دبا بھی دیا۔ میں نے اُس کے ایک طمانچہ مارا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اندھیر بہت زیادہ تھا' مجھ کو اِس خواب نے اور جل محل کی یاد نے بے قرار کر دیا اور میں چھپّر کے دروازے پر گاڑھے کی چادر اُوڑھے ہوئے آ کر کھڑی ہو گئی۔ مینہ بہت زور سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو صحن کا پانی دکھائی دیتا تھا اور مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جل محل محل کے صحن میں کھڑی ہوئی ماہتاب اور عالم آب کا تماشا دیکھ رہی ہوں۔

جب سے مصیبت کے دن آئے تھے' میں کبھی نہیں گھبرائی اور میں نے کبھی اچھے دنوں کو یاد نہیں کیا۔ لیکن آج خبر نہیں کیا بات تھی کہ میں جل محل کو یاد کرتی تھی اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ میں شہنشاہ ہند کی پوتی ہوں اور اب یہ خیال بھی آتا تھا کہ میں اپنے باپ کی لاڈلی ہوں اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ میں سترہ برس کی عمر تک شہزادی تھی اور آج ایک مفلس و نادار نوکرانی ہوں۔ میرے ہاں سارے قلعہ سے اچھے اور نفیس کپڑے تھے اور ہر چیز نہایت صفائی اور ستھرائی سے رکھی جاتی تھی اور یہی میرا رات دن کا مشغلہ تھا مگر آج سب اِس کے برعکس ہے۔ انا کے گھر میں جو زیور اور جواہرات دفن کرائے تھے' بعد میں اُس کو خفیہ طور پر کھود کر دیکھا تو سب غائب تھا۔ خبر نہیں کون لے گیا' گویا پچھلے زمانہ کی کوئی چیز بھی باقی نہ رہی۔ صرف میں باقی ہوں اور وہ بھی بدلی ہوئی اور ہر

بات مٹی ہوئی۔

اِن خیالات کا مجھ پر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ مجھے غش آ گیا اور میں وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑی اور صبح تک بے ہوش پڑی رہی۔ صبح ہوئی تو وہی میں تھی جس کو گھو کہہ کر سب پکارتے تھے اور وہی چولہا تھا جہاں میں روٹی پکاتی تھی اور وہی سب گھر کے کام تھے جو مجھے رات دن لونڈیوں سے بڑھ کر محنت کے ساتھ کرنے پڑتے تھے اور میں کہتی تھی:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

یہ مصرع تو بالکل ہو بہو مجھ ہی پر صادق آتا تھا۔

☆☆☆☆☆

غدر کی زچہ

نواب فولاد خاں کی لاش پہاڑی مورچے سے گھر میں آئی تو اُن کی بہو کے دردِ زہ ہو رہا تھا۔ اُس وقت دہلی کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں بھاگنے اور شہر سے نکلنے کی تیاری نہ ہو رہی ہو۔ بہادر شاہ بادشاہ کی نسبت عام چرچا ہو گیا تھا کہ وہ لال قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں چلے گئے۔

نواب فولاد خاں خاندانی امیر تھے مگر اُن کے والد کسی قصور کے سبب معین الدین اکبر شاہ کے دربار میں معتوب ہوئے اور منصب و جاگیر ہاتھ سے دے بیٹھے۔ اِس وقت فولاد خاں جوان تھے اور اُنھوں نے انگریزی فوج میں نوکری کر لی تھی۔ فوج باغی ہوئی تو یہ بھی انگریزی سرکار سے برگشتہ ہو گئے۔ آخری دن وہ اپنے رسالہ کو لے کر دھاوے پر گئے تھے۔ پہاڑی پر انگریزی مورچہ تھا۔ بڑی بہادری اور جی داری سے لڑے اور آخر ایک گولے کا ٹکڑا لگنے سے اُن کا کام تمام ہو گیا۔ سپاہی لاش کو گھر میں لائے تو یہ تماشا دیکھا کہ اُن کی بہو کے دردِ زہ ہو رہا ہے اور دائی کوئی ملتی نہیں تھی۔

فولاد خاں کا جوان بیٹا چار دن پہلے مارا گیا تھا۔ غریب عورت چار دن کی بیوہ تھی۔ ساس کو مرے ہوئے دو برس گزر چکے تھے۔ گھر میں سسرال کے سوا اور کوئی والی وارث نہ تھا۔ اب وہ بھی خون میں نہائے، آنکھیں بند کئے، چہرہ پر مردنی کی نقاب ڈالے گھر میں آئے تو سکینہ خانم کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔

گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ ایک چھوڑ چار چار مامائیں خدمات کیلئے حاضر، لیکن سر دھرے کی ڈھارس ہی اور ہوتی ہے۔ سکینہ خانم نے سسرے کا مرنا سنا تو ہائے کا نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

لاش صحن میں رکھی تھی۔ سپاہی دروازے پر کھڑے تھے۔ سکینہ دالان میں پلنگ پر بے ہوش پڑی تھی۔ دو مامائیں سکینہ کے سرہانے پائنتی دم بخود بیٹھی تھیں اور دو اوسان باختہ کھڑی قدرت کی یہ سیر دیکھتی تھیں اور زار و قطار روتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد سکینہ خانم کو ہوش آیا اور درد کی شدت سے بے تاب ہو کر اُس نے ماما سے کہا: دیکھو ڈیوڑھی پر کوئی سپاہی ہو تو اُس سے دائی کو تلاش کراؤ۔ ماما دوڑی ہوئی دروازے پر گئی اور ہے ہے ہے کہتی ہوئی اُلٹے پاؤں واپس آئی اور کہا: بی بی! سپاہیوں کو گورے خاکی پکڑے لئے جاتے ہیں اور وہ گورے خاکی وردی والے (غدر میں انگریزی سپاہیوں کا نام خاکی تھا) ہمارے گھر کے قریب آتے ہیں۔ سکینہ بولی: مردار! دروازہ تو بند کر۔ ماما پھر اُلٹی پھری اور اُس نے دروازے کے کواڑ بند کر دیئے۔ اب درد اور بڑھا اور بے چاری سکینہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ نہ دائی پاس تھی نہ کچھ اور سامان، قدرت نے خود ہی مشکل آسان کر دی، مگر سکینہ غریب صدمے سے پھر بے ہوش ہو گئی۔ ماما نے جلدی سے لڑکے کو نہلایا اور نہالچے میں لپیٹ کر گود میں لے لیا۔

سکینہ کی عمر سترہ سال کی تھی۔ شادی کو صرف سوا برس ہوا تھا۔ میکہ فرخ آباد اور دہلی میں جہاں یہ افراتفری تھی، ہوش آیا تو اُس نے ماما سے کہا: مجھے سہارا دو، اُٹھا کر بٹھاؤ۔ وہ بولی: بیٹی! ایسا غضب نہ کرنا، ابھی لیٹی رہو، تم میں بیٹھنے کی حالت کہاں ہے۔ سکینہ نے کہا: توبہ بوا! یہ وقت کہیں اِن احتیاطوں کا ہے۔ قسمت خبر نہیں ابھی اور کیا کیا دکھائے گی۔

ماما نے یہ سن کر سر کو سہارا دیا اور سکینہ کو بٹھا کر گاؤ تکیہ کمر سے لگا دیا۔ سکینہ نے پہلے اپنے بچے کو ماتا بھری نظروں سے دیکھا، جو دنیا میں اُس کی سب سے پہلی مراد تھی اور چاہے کہ برابر دیکھے جائے، مگر اُس کو شرم آ گئی اور اُس نے مسکرا کر اپنا رُخ بچہ کی طرف سے ہٹا لیا۔ جوں ہی اُس کی نظر صحن کی طرف گئی، فولاد خاں کی میت رکھی دکھائی دی۔ اُس کی خوشی کو ایک دھکا سا لگا جس سے وہ بے تاب ہو گئی اور دانشمند ہونے کے باوجود اُس کے منہ سے بہکی بہکی باتیں نکلنے لگیں، اُس نے کہنا شروع کیا:

> "اپنے یتیم پوتے کو دیکھ لیجئے، اُٹھیے، جس کی آپ کو بہت آرزو تھی۔ وہ پیدا ہو گیا۔ اُس کے باپ کو گود میں لے کر قبر میں سلایا تھا، اِس کو بھی آغوش میں لے کر قبر میں سو جایئے۔ میں بے وارثی اُس کو کہاں رکھوں، کیوں کر رکھوں۔ اِس ننھے مہمان کو کیا خبر کہ جس گھر میں وہ آیا ہے وہ ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ دہلی میں آپ میرے باپ تھے، آپ بھی مر گئے۔ فرخ آباد میں میرے باپ ہیں مگر وہ جیتے جی مجھ سے بچھڑ گئے۔ اِس لڑکے کا بھی ایک باپ تھا جس سے میری دنیا آباد تھی، اُس کو بھی گولی نے مار ڈالا"

یہ فقرہ کہہ کر سکینہ کو کچھ خیال آ گیا۔ اُس نے دل کی چھپی ہوئی تکلیف سے بے تاب ہو کر آہستگی سے بایاں ہاتھ اِس پر رکھ دیا اور دایاں ہاتھ منہ پر رکھ کر گردن تکیہ سے لگا کر رونے لگی اور روتے روتے اُس کو پھر غش آ گیا۔

ماما نے سکینہ کو غشی میں چھوڑا اور دروازہ کھول کر باہر گئی کہ کسی کو بلائے اور فولاد خاں کی میت کے دفن کا بندوبست کرے مگر اُس کو ساری گلی سنسان نظر آئی۔ ایک آدمی بھی چلتا پھرتی دکھائی نہ دیا' تو اشارے سے دوسری ماما کو بلایا اور کہا: بوا اپنی جان کی خیر مناؤ اور چلو' یہاں سے بھاگ چلو۔ بیوی کے ساتھ رہیں گے تو جان مفت میں جاتی رہے گی۔

وہ بولی: ایسے کٹھن وقت میں مالک کو دغا دینا اور اپنی جان لے کر بھاگ جانا بڑی بے وفائی اور بے مروتی کی بات ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ ایک بے کس بچہ بھی ہے۔ پہلی نے جواب دیا کہ دیوانی بنی ہے۔ کس کی وفا' کیسی مروت' جان ہے تو جہان ہے' میں تو جاتی ہوں' تو جانے تیرا کام۔ خاکی ابھی آتی ہوں گے' گھر لوٹ لیں گے اور ہم سب کو مار ڈالیں گے۔ یہ بات سُن کر دوسری کے دل میں بھی سختی پیدا ہوئی اور اُس نے تیسری اور چوتھی کو اشارے سے پاس بلوایا۔ وہ نامرادیں بھی بھاگنے پر آمادہ ہو گئیں اور کہا: چلتی ہو تو کچھ خرچ لے چلو' سکینہ بے ہوش ہے' کنجیاں سرہانے سے لے لو اور نقدی کا صندوقچہ کوٹھی سے نکال کر چل دو۔

جس کی گود میں بچہ تھا' اُس کو ترس آ گیا اور کہنے لگے: اِس کو کون رکھے گا۔ ایک نے کہا: ماں کے پاس لٹا دو۔ بولی: نہیں بوا! میں اِس کو ساتھ لے کر چلوں گی۔ سب ایک منہ ہو کر بولیں: واہ سبحان اللہ! اپنی جان تو سنبھلتی نہیں' بچہ کو کیونکر سنبھالو گی۔ اِس کے علاوہ بیچاری سکینہ پھڑک کر مر جائے گی' تم کو رحم نہیں آتا۔ اُس نے جواب دیا: تم سکینہ کو اکیلا چھوڑ کر جاتی ہو' اِس پر تم کو رحم نہیں آتا۔ نہیں میں اِس لال کو کیوں نہ لے جاؤں۔ میں اپنی بیٹی کو دوں گی' وہ اِس کو پالے گی۔ اِس کا بچہ بھی مر گیا ہے۔ یہاں چھوڑا تو سکینہ بھی مرے گی اور یہ بچہ بھی۔

آخر وہ چاروں نقدی کا صندوقچہ اور بچے کو ساتھ لے کر گھر سے نکل کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلی گئیں اور سکینہ کو اِس گھر میں اکیلا چھوڑ دیا جہاں ایک لاش کے سوا اور کوئی دوسرا آدمی نہ تھا۔

سکینہ پر زچگی' بے کسی و پریشانی کا ایسا اثر ہوا تھا کہ چار گھنٹے بے ہوش رہی۔ رات کے آٹھ بجے ہوش آیا تو گھر میں گھپ اندھیرا تھا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ جب کچھ دکھائی نہ دیا تو سمجھی کہ میں مر گئی اور یہ قبر کی تاریکی ہے۔ بے اختیار منہ سے کلمہ نکلا اور اُس نے

کہنا شروع کر دیا: "دین میرا اسلام' رسول میرا محمد ﷺ' خدا میرا ایک وحدہ لاشریک' یا اللہ! توبہ ہے میں بے گناہ ہوں' میری قبر کو اندھیرے میں رکھ نہ اور جنت کی روشنی دے" تھوڑی دیر میں اِس کو آسمان پر تارے چمکتے دکھائی دیے اور وہ سمجھی کہ میں زندہ ہوں اور پلنگ پر لیٹی ہوں' تب تو اُس نے ماماؤں کو آوازیں دینی شروع کیں۔ جب کوئی نہ بولا تو ڈر کر اور بے اوسان ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی کمزوری جاتی رہی یا اُس کو یاد نہ رہا کہ میں کمزور ہوں۔ پلنگ سے نیچے اُتری' شمع روشن کی تو اُس نے دیکھا کہ گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے۔ صحن میں سسرے کی لاش رکھی ہے۔ اِس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

رات کے وقت مردے کو دیکھ کر اُس کو بہت ڈر لگا اور چیخیں مارنے لگی۔ محلّہ میں کوئی آدمی ہوتا تو چیخنے کی آواز سے دوڑ کر اندر آتا مگر محلّہ والے تو پہلے ہی سب بھاگ چکے تھے۔ سکینہ چیختے چیختے ایسی دہلی اور ایسی ڈری کہ اُس کے حواس جاتے رہے اور تڑاخا کھا کر فرش پر گری اور اُس کو غش آ گیا۔ صبح تک اُس کے حواس درست نہ ہوئے اور وہ فرش پر بے ہوش پڑی رہی۔ دن چڑھا تو اُس نے آنکھ کھولی۔

اُس وقت دل میں ایک طرح کی سہار اُس کو معلوم ہوئی۔ اگرچہ دو وقت سے اُس نے کچھ کھایا نہ تھا مگر غم اور خوف مصیبت کی طرح تیزی میں انسان کو مضبوط بنا دیتا ہے۔ اُس کے علاوہ فوجی گھرانہ میں پرورش پانے کے سبب اُس کا دل بھی عام عورتوں کی طرح بودا نہ تھا۔ اُس نے چاہا کہ میت کو دفن کرنے کی تدبیر کرے اور خود کچھ کھائے کیونکہ بھوک اُس کو شدت کی معلوم ہوتی تھی۔ یکا یک اُس کو خیال آیا کہ میرا بچہ کیا ہوا۔ اِس خیال کا آنا تھا کہ کلیجہ میں ممتا کی ایک ہوک سی اُٹھی اور اُس نے دیوانوں کی طرح دوڑ دوڑ کر سارے گھر کو ڈھونڈنا شروع کیا اور جب کہیں بچہ نہ ملا تو پانی کے مٹکوں کی چپنیاں اُٹھا اُٹھا کر مٹکوں میں جھانکنے لگی کہ اُن کے اندر میرا بچہ نہ ہو' پلنگ کے تکیے اُٹھا اُٹھا کر چھاتی سے لگانے لگی۔

آخر مصیبت کے عروج نے پھر اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُس کے دل کو تھوڑی سی تسلی دی اور وہ بچہ کے خیال کو بھول گئی اور سسرے کے دفن کا خیال پھر اُس کے سامنے آ گیا۔ اُس نے الماری کھولی اور ایک سفید چادر نکالی اور شہید کی لاش پر ڈال دی اور مصلّی بچھا کر سجدے میں گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی:

"اے خدا! تیرے ایک بندے کی لاش ہے جس کو نہ کفن میسر ہے نہ دفن۔ قبر
نصیب ہے نہ نماز۔ اپنے فرشتوں کو بھیج کہ وہ اُس کی نماز پڑھیں اور اپنی آغوش
رحمت میں اُس کو دفن کردے۔ مجھے سب نے دغا دی۔ میرا تاجدار بھی ملک خاک
کے پردیس میں چلا جاتا گیا۔ بس میرا لال بھی مجھ سے چھن گیا۔ اب تیرے سوا کوئی
وارث نہیں ہے۔ یہ بے کسی کا سجدہ قبول کر اور میرا ہاتھ پکڑ"

سکینہ خانم ابھی سجدے میں تھی کہ دروازہ کھلا اور چار سپاہی خاکی وردی پہنے ہوئے اندر آئے۔ سکینہ نے جلدی سے اُٹھایا اور نامحرم مردوں کو آتا دیکھ کر چادر چہرہ پر ڈال لی اور ڈر کر کونے میں چھپنا چاہا مگر سپاہی اندر آ چکے ہیں۔ اُنہوں نے سکینہ کو پکڑ لیا اور زبردستی چہرہ کھول کر دیکھا اور سب مل کر بولے: جوان ہے' جوان ہے اور بڑی خوبصورت۔

اِس کے بعد اُنہوں نے سکینہ کو چھوڑ دیا اور گھر کا سب اسباب دیکھنے لگے۔ نقدی تو ماما ئیں لے گئی تھیں' کچھ زیور اور نفیس کپڑے اُنہوں نے لوٹے۔ صحن میں میت کے اُوپر سے چادر اُٹھا کر اُنہوں نے کہا' او تو یہ کوئی بڑی باغی ہے۔

اِس کے بعد سپاہیوں نے سکینہ کو ہاتھ سے پکڑ کے اُٹھا لیا اور کہا چل ہمارے ساتھ۔ سکینہ منہ سے کچھ نہ بولی اور سپاہیوں کے جبر سے مجبور ہو کر کھڑی ہو گئی۔ وہ نہ کہہ سکی کہ میں زچہ ہوں۔ اُس نے نہ کہا کہ میں بھوکی ہوں' اُس کے منہ سے نہ نکلا کہ مجھے نہ ستاؤ۔ میرا اِس دنیا میں کوئی حامی نہیں ہے۔ اِس کو خاندانی شرافت اور غیرت بات کرنے سے روکتی تھی۔

جب سپاہی اُس کو گھسیٹ کر لے چلے اور سکینہ دروازے پر پہنچ گئی تو اُس نے مڑ کر گھر کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

"رخصت اے سسرال' سلام اے بے گور و کفن کرنے والے' میں اِن تلوار
چلانے والوں کی ناموس ہوں جو زندہ ہوتے تو اپنی آبرو پر مر جاتے"

سکینہ کے اِس درد بھرے فقرے پر سپاہی ہنسے اور اُس کو کھینچتے ہوئے باہر چلے گئے۔ سکینہ کچھ دُور تک چپ چاپ چلی گئی۔ اِس کے بعد اُس نے کہا:

"میں زچہ ہوں' مجھ پر رحم کرو۔ میں بھوکی ہوں' مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں تمہارے
ملک کی ہوں' میں تمہارے مذہب کی ہوں' میں عورت ہوں اور بے خطا ہوں"

یہ سُن کر چاروں سپاہی رک گئے اور اُنہوں نے افسوس کر کے کہا: تو نہ گھبرا ہم تیرے لئے

سواری لاتے ہیں۔ یہ کہہ کر تین آدمی ٹھہر گئے اور ایک آدمی زخمیوں کی گاڑی لایا جس میں سکینہ کو ڈال کر پہاڑی کے کیمپ میں لے گئے۔

بارہ برس کے بعد

کسی کو معلوم نہیں' غدر کی زچہ سکینہ پر بارہ برس کیسے گزری اور وہ کہاں رہی اور اُس نے کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں۔ ہم نے جب اُس کو دیکھا تو رہتک کے ایک محلّہ میں وہ بھیک مانگ رہی تھی۔ اُس کے پاؤں میں جوتی نہ تھی' اُس کا پاجامہ پھٹا ہوا تھا' اُس کا کرتہ بے حد میلا اور پیوند دار تھا اور سر کا دوپٹہ بالکل پھٹا ہوا ایک چیتھڑا معلوم ہوتا تھا۔ وہ غالباً بہت فاقہ زدہ تھی' ہڈی سے چمڑہ لگ گیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے' سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے' چہرے پر حسن موجود تھا مگر لٹا ہوا۔ آنکھوں میں قدرتی زیبائش موجود تھی لیکن اُجڑی ہوئی اور ستائی ہوئی۔ وہ چلتے میں چکراتی تھی اور دیوار پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیتی تھی۔ اُس کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے تو ذرا ٹھہر کر سانس لیتی تھی' پھر آگے بڑھتی تھی۔

تھوڑی دُور جا کر اُس کو ایک شادی کا گھر ملا جہاں سینکڑوں آدمی کھانا کھا کر باہر آ رہے تھے۔ یہ وہاں ٹھہر گئی اور اُس نے بڑے دردناک انداز میں یہ صدا لگائی:

"فلک کی ستائی ہوں' بڑے گھر کی جائی ہوں' عزت گنوا کر شرم مٹا کر روٹی
کھانے آئی ہوں' بھلا ہو صاحب' روٹی کا ٹکڑا مجھ کو بھی' سہرے کی خیر' گھوڑے کی
خیر' جوڑے کی خیر' ایک نوالہ مجھ کو بھی"

سکینہ کی صدا فقیروں کے غل شور میں کسی نے نہ سنی بلکہ ایک نوکر نے جو شادی کا منتظم تھا' اُس کو ایسا دھکا دیا کہ بیچاری چاروں شانے چت گر پڑی اور گرتے وقت بے کسی کے لہجے میں اُس نے کہا:

"میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا' مجھے نہ مار کہ میں خود قسمت کی ماری ہوئی
ہوں۔ اے خدا! میں کہاں جاؤں' اپنی بپتا کس کو سناؤں"

یہ کہہ کر رونے لگی۔ ایک لڑکا کھڑا ہوا یہ حال دیکھ رہا تھا۔ اُس کو خود بخود سکینہ پر ترس آیا اور بے اختیار رونے لگا۔ اُس نے سکینہ کو سہارا دے کر اُٹھایا اور کہا: آؤ میرے ساتھ چلو' میں تم کو روٹی دوں۔ سکینہ لڑکے کے ساتھ بمشکل اُٹھ کر گئی۔ لڑکا قریب کے ایک گھر میں خدمت گاری پر نوکر

تھا' وہاں لے گیا اور شادی کا آیا ہوا اپنے حصے کا کھانا اُس کے آگے رکھا۔ سکینہ نے دو لقمے کھائے' پانی پیا' آنکھوں میں دم آیا تو لڑکے کو ہزار ہزار دعائیں دینے لگی۔

اب جو اُس نے لڑکے کو غور سے دیکھا تو اُس کے دل میں دھواں سا اُٹھا اور وہ بے اختیار ہو کر لڑکے کے گلے لگ کر رونے لگی اور لڑکا بھی سکینہ کو چمٹ کر بے تاب ہو گیا۔ سکینہ نے پوچھا: تو کس کا بچہ ہے؟ بولا: میری ماں اِس گھر کی ماما ہے اور میں بھی یہیں نوکر ہوں۔ سکینہ نے کہا: تمہاری ماں کہاں ہے؟ لڑکے نے جواب دیا: وہ اور نانی دونوں شادی میں گئی ہوئی ہیں۔ اِن چودھرائن کے ساتھ جن کی وہ نوکر ہیں۔ سکینہ یہ سُن کر چپ ہو گئی' مگر وہ سوچتی تھی کہ اِس لڑکے پر مجھے ایسی محبت کیوں آ رہی ہے' بے شک اِس نے مجھ پر احسان کیا ہے لیکن احسان دل کو بے قرار نہیں کرتا۔

اتنے میں لڑکے کی ماں اور نانی گھر میں آئیں تو سکینہ نے فوراً پہچان لیا کہ لڑکے کی نانی سکینہ کی ماما ہے جو غدر میں اُس کے بچے کو لے کر بھاگ گئی تھی۔ ماما نے سکینہ کو نہ پہچانا' مگر جب سکینہ نے اُس کا نام لے کر پکارا اور اپنا نام وحال اُس کو بتایا تو ماما اُس کو لپٹ گئی اور بے اختیار رونے لگی۔ لڑکے کو معلوم ہوا کہ میں دراصل سکینہ کا بیٹا ہوں تو وہ پھر دوبارہ سکینہ کو چمٹ کر رونے لگا اور سکینہ نے اپنے بچے کو چھاتی سے لگا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"شکر اے پروردگار! احسان اے مولا کہ غدر کی تباہی میں میرے بچہ کو زندہ رکھا اور بارہ برس کے بعد مجھ بگڑی کے دن پھیر دیئے"

اِس کے بعد سکینہ نے فرخ آباد اپنے میکہ میں خط بھجوایا۔ وہاں ماں باپ مر چکے تھے' تین بھائی زندہ تھے۔ وہ رہتک آئے اور بہن اور بھانجے کو ہمراہ لے گئے۔ لڑکے نے ماما اور اُس کی لڑکی یعنی اپنی پالنے والی کو ساتھ لیا اور فرخ آباد جا کر اُنہوں نے امیرانہ زندگی بسر کی۔

☆☆☆☆☆

کفنی

"دلشاد گدگدیاں نہ کر مجھے سونے دے۔ نماز قضا ہوتی ہے تو کیا کروں۔ آنکھ کھولنے کو جی نہیں چاہتا"

"بیوی گدگدیاں میں نے نہیں کیں۔ یہ گلاب کا پھول تمہارے تلووں سے آنکھیں مل رہا ہے"

"میں اِس پھول کو مسل ڈالوں گی۔ اتنے سویرے مجھے کیوں جگاتی ہے۔ میرا دل ابھی سونے کو چاہتا ہے۔ ذرا سندری کو بلا۔ بانسری بجائے' ہلکے سروں میں بھیرویں سنائے۔ گل چمن کہاں ہے' چپی کرے تو کوئی کہانی شروع کر"

"کہانی کہوں گی تو مسافر راستہ بھولیں گے۔ دن کو کہانی نہیں کہنی چاہیے۔ سندری حاضر ہے۔ گل چمن کو بلاتی ہوں' اماں جان آ جائیں تو خفا ہوں گی کہ مہ جمال کو اب تک بیدار نہیں کیا' نماز کا وقت جاتا ہے"

سندری بانسری بجا رہی تھی کہ مہ جمال نے آنکھیں کھول دیں' بالوں کو سمیٹا' مسکرائی' کلمہ پڑھا' نرگس نے سلام کیا۔ جواب میں اُس کے ایک چٹکی لی گئی' انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی اور کہا:

"دلشاد! ہم نے نرگس کے چٹکی لی تو یہ ہنسی نہیں۔ منہ بنا لیا۔ آ تو آ۔ تیرے کان مروڑوں اور تو خوب ہنس"

دلشاد اُٹھ کر بھاگی' دور جا کھڑی ہوئی اور کہا: لیجیے میں کھلکھلا کر ہنستی ہوں' آپ سمجھ لیجیے کان مروڑ دیئے"

مہ جمال نے پھر انگڑائی لی اور مسکراتی ہوئی طشت چوکی پر گئی۔ وضو کیا' نماز پڑھی' صحن میں نکلی' باغ کے پاس تخت پر بیٹھ کر قرآن شریف شروع کیا۔ سب لونڈیاں فرش کی درستی میں مصروف ہوئیں' ناشتہ کا سامان کرنے لگیں۔

مہ جمال تلاوت سے فارغ ہوئی تو مالن چنگیر میں چند ہری مرچیں لئے حاضر ہوئی۔ پہلے مہ جمال کی بلائیں لیں' دعائیں دیں' پھر بولی: سرکار آج حضور کے لگائے ہوئے پودوں میں یہ مرچیں لگی تھیں' نذر کیلئے لائی ہوں''

مہ جمال نے چنگیر لے لی۔ سب لونڈیوں کو پکارا اور مرچوں کی آمد سے محل میں ایک دھوم مچ گئی۔ نرگس نے کہا: ''کیسی ہری ہری چکنی صورت ہے'' دلشاد بولی: ''جیسی بیوی کے گال'' سندری نے کہا: ''کیسی چپ چاپ چنگیر میں لیٹی ہیں جیسے بیوی چھپر کھٹ پر سوتی ہیں'' گل چمن بولی: ''ڈالی سے ٹوٹی ہیں' گھر سے چھوٹی ہیں' اس لئے ذرا چپ چپ ہیں''

مہ جمال نے کہا: ''مالن کو جوڑا دو' کپڑے پہناؤ' پانچ روپے نقد بھی دینا' میرے درختوں کا پہلا پھل لائی ہے' اس کا منہ بھی میٹھا کرنا''

مالن کو ریشمی جوڑا ملا۔ چاندی کے کڑے پہنائے گئے۔ لڈو کھلائے گئے' پانچ روپے نقد اور ایک پان کا بیڑا ملا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی اپنے گھر گئی۔ یہاں اماں جان کو لونڈی خبر دینے پہنچی کہ بیوی کے درختوں کا پہلا پھل آیا ہے۔ وہ برابر کے مکان سے آئیں۔ مغلانی ساتھ تھیں' بیٹی کی بلائیں لیں۔ مہ جمال نے آداب کیا۔ اماں اور مغلانی نے مرچوں کی خوب تعریفیں کیں اور تھوڑی دیر تک مرچوں کا غلغلہ گھر میں برپا رہا۔

مہ جمال خورشید جمال کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اُس کے والد میرزا علی گوہر عرف میرزا نیلی شاہ عالم کے بیٹے اکبر شاہ ثانی کے بھائی تھے جو مر چکے تھے۔ خواصوں سے اُن کے کئی بیٹے تھے مگر بیگم سے صرف مہ جمال ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی اور وہ بھی بڑھاپا آجانے کے بعد۔ جب میرزا نیلی مرے ہیں تو مہ جمال کی عمر پانچ سال کی تھی۔ اب ماشاء اللہ پندرہویں سال میں ہے۔ صورت سانولی ہے' چہرہ کتابی ہے' قد میانہ ہے' آنکھیں سیاہ اور بے حد رسیلی اور مخمور ہیں۔ آواز میں قدرتی درد ہے۔ جب ہنس کر بولتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرثیہ پڑھا گیا۔ سن کر کلیجہ پر چوٹ لگتی ہے۔ وہ بہت چنچل' شوخ' آرام طلب اور نازک مزاج ہے' لاڈ پیار میں پلی ہے' شہزادی ہے' ماں باپ کی اکلوتی ہے اور کچھ فطرتاً ضدی اور ہٹیلی ہے۔ بدن بہت دبلا ہے۔ چلتی ہے تو غیر مصنوعی انداز سے بدن کو جھکاتی' پھولوں کی ٹہنی کی طرح اِدھر اُدھر ہچکولے کھاتی ہوئی چلتی ہے۔ ٹھوکریں قدم قدم پر لگتی ہیں۔ لونڈیاں ساتھ دوڑتی ہیں۔ بسم اللہ یا اللہ خیر کہتی جاتی ہیں۔

پھول والوں کی سیر تھی۔ بہادر شاہ اپنے محل میں جو درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب کے

دروازہ کے قریب بنا تھا' تشریف رکھتے تھے۔ بیگمات اندر تھیں مگر خورشید جمال اور مہ جمال نے دوسرا مکان لیا تھا' کیونکہ میرزا نیلی کے وقت سے اُن کی اور بہادر شاہ کی ان بن تھی۔ بہادر شاہ کو انگریز لاکھ روپے دیتے تھے' اُس میں سے بارہ ہزار روپے مہینہ خورشید جمال کا علیحدہ بھیج دیا جاتا تھا۔ سستا سماں تھا' ہزار روپے آج کل کے لاکھ روپے کے برابر تھے اور خورشید جمال خوب عیش آرام سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ جس شام کو پنکھا چڑھا' مہ جمال عصر کے وقت سے برآمدہ میں چلمن کے پاس بیٹھی تھی۔ نفیری بج رہی تھی۔ دہلی کے ہندو مسلمان زرق برق کپڑے پہنے پنکھے کے ساتھ تھے۔ دکانیں آراستہ تھیں' سقے کٹورے بجا رہے تھے۔

مغرب کا وقت آیا تو خورشید جمال نے لونڈیاں سے کہلا بھیجا کہ پہلے آن کر نماز پڑھ لو پھر تماشا دیکھنا۔ مہ جمال اُٹھی تو چلتے وقت اُس نے دیکھا کہ ایک فقیر سفید کفنی پہنے' زرد چہرہ' ننگے سر' پنکھے کے پاس سے گزر کر اُس کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اُس کی صورت اور کفنی دیکھ کر مہ جمال ڈر گئی۔ نماز میں بھی اِسی کا خیال رہا۔ سیر سے فارغ ہو کر سوئی تو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ماں کو خبر ہوئی' اُس نے کچھ پڑھ پڑھ کر دم کیا۔ صندوقچہ سے ایک نقش نکال کر گلے میں ڈالا۔ فقیروں کو خیرات بھجوائی۔

دوپہر کو بخار تیز ہو گیا۔ مہ جمال چونکتی تھی اور کہتی تھی: وہ کفنی والا آیا' وہ مجھ کو بلاتا ہے' اماں جی آنا وہ دیکھو کھڑا مسکراتا ہے''

ماں نے لونڈیاں سے پوچھا۔ اُنہوں نے کہا: ایک فقیر کل شام کو کفنی پہنے جاتا تھا' بیوی نماز کیلئے اُٹھیں تو چلمن کا پردہ ہٹ گیا۔ فقیر نے اُن کو گھور کر دیکھا اور بیوی نے اُس کو دیکھا۔ اِس کے بعد وہ کہیں چلا گیا''

خورشید جمال نے نوکروں کو حکم دیا کہ اِس حلیہ کا فقیر جہاں ملے' اُس کو لاؤ۔ نوکر سارے میلے میں ڈھونڈتے پھرے۔ شام کے قریب وہ فقیر ملا۔ اُس کو ساتھ لے کر مکان پر آئے۔ خورشید جمال نے پردہ کے پاس بٹھا کر لڑکی کا حال کہا۔ وہ بولا مجھے اندر لے چلو۔ میں دم کر دوں گا' اچھی ہو جائے گی۔ خورشید جمال نے اندر پردہ کرایا۔ فقیر کو پلنگ کے پاس کھڑا کیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھے اور کچھ دیر چپ کھڑا رہا اور پھر کہا: ''لو لڑکی اچھی ہو گئی''

دیکھا تو واقعی بخار اُتر گیا تھا۔ مہ جمال اُٹھ بیٹھی۔ خورشید جمال اور سب لونڈیاں حیران ہو گئیں۔ فقیر کو بٹھایا۔ کچھ روپے اور کپڑے کے دو تھان نذر پیش کئے۔ فقیر نے کہا:

''یہ میں نہیں لیتا' مجھے لڑکی کی صورت دکھا دو ورنہ پھر بیمار ہو جائے گی''

خورشید جمال نے پہلے تو کچھ تامل کیا' پھر خیال آیا کہ فقیر تو ماں باپ ہوتے ہیں' پردہ ہٹایا۔ مہ جمال نے فقیر کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ فقیر نے مہ جمال کو دیکھا اور برابر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد "بھلا ہو بابا" کہہ کر اُٹھا اور چلا گیا۔

یہ تیس برس کا جوان تھا مگر بیمار معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ پر زردی بہت زیادہ تھی۔ سفید کفنی کے سوا کوئی کپڑا پاس نہ تھا۔ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا روتے روتے سوج گئی ہیں۔

یہ شخص اُس مالن کا بیٹا تھا جو مہ جمال کے باغ کی محافظ تھی۔ مہ جمال کو ایک سال پہلے اُس نے باغ میں دیکھا تھا۔ اپنی غریبی اور مہ جمال کی شان کا خیال کر کے اُس کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ اِس تکلیف کو کسی کے سامنے بیان کرے جو کہ مہ جمال کے دیکھنے سے خود بخود اُس کے اندر پیدا ہوگئی تھی۔

چھ مہینے وہ اِس خلجان میں پریشان رہا۔ اِس کے بعد اُس کو ایک ہندو جوگی ملا جس سے اُس نے اپنا حال بیان کیا۔ جوگی نے ایک سفید کفنی دی کہ اِس کو پہن لے۔ تیرے سب کام پورے ہو جائیں گے۔ کفنی پہنتے ہی وہ نیم مجذوب ہوگیا اور گھر بار چھوڑ کر جنگل میں نکل گیا۔ چھ مہینے تک جنگلوں میں پھرتا رہا۔ چھ ماہ کے بعد اب پھر وہ آبادی میں آیا تھا' جہاں اُس نے مہ جمال کو دیکھا مگر اب اُس کے دیکھنے میں ایسی قوت پیدا ہوگئی تھی کہ مہ جمال کو اُس نے ایک نگاہ میں بیمار کر ڈالا۔

14 ستمبر 1857ء کو ایک رتھ نجف گڑھ کے قریب کھڑا تھا اور خاکی وردی کے فوجی سپاہی اُس کو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ سب لشکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس رتھ میں خورشید جمال' مہ جمال اور دو لونڈیاں سوار تھیں' باہر چار نوکر تلواریں لئے کھڑے تھے۔ فوج والے کہتے تھے کہ ہم اندر کی تلاشی لیں گے' اِس میں کوئی باغی پوشیدہ ہے۔ بیگم کے نوکر کہتے تھے' اندر عورتیں ہیں' ہم پردہ نہ کھولنے دیں گے۔ نوبت لڑائی کی پہنچی' نوکروں نے تلوار چلائی اور وہ سب ایسے لڑے کہ ایک بھی زندہ نہ بچا۔ فوجیوں نے رتھ کا پردہ اُلٹ دیا۔ عورتوں کو دیکھا اور زیور کا صندوقچہ چھین لیا۔ اِس کے علاوہ جس قدر اسباب تھا' وہ بھی لوٹ کر آگے بڑھ گئے۔ رتھ بان بھاگ گیا تھا۔ بیگم لونڈیوں کو لے کر نجف گڑھ کی طرف چلیں کہ اتنے میں چند گوجر لٹھ لئے ہوئے آئے اور اُن سے زیورات اور کپڑے مانگنے لگے۔ بیگم نے کہا: ہم کو فوج والوں نے لوٹ لیا ہے' اب ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں ہے' تم رتھ اور بیل لے لو مگر گوجر نہ مانے اور اُنھوں نے زبردستی اُن کے برقعے اُتار ڈالے۔ پاجاموں کے سوا تمام کپڑے چھین لئے۔ خورشید جمال اور لونڈیوں نے اُن کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ ایک گوجر نے خورشید جمال کے سر پر لکڑی ماری اور دوسرے نے لونڈیوں پر لکڑیوں کے وار کئے۔ مہ جمال ڈری سہمی چپ کھڑی تھی۔ اُس کو کسی نے نہ چھیڑا۔ خورشید جمال کا سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر مرگئیں۔ لونڈیاں بھی دونوں چوٹ کے صدمے سے تمام ہوگئیں۔ مہ جمال اکیلی کھڑی تماشہ دیکھتی تھی۔ ماں کو مرتے دیکھا تو چمٹ کر رونے لگی۔ گوجر لوٹ مار کر کے چلے گئے اور مہ جمال روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ نہ اُس کی ماں کی لاش ہے' نہ لونڈیوں کی لاشیں ہیں' نہ وہ جنگل ہے بلکہ وہ ایک گھر کے اندر چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے۔ سامنے ایک گائے بندھی کھڑی ہے۔ چند مرغیاں صحن میں پھر رہی ہیں اور ایک میواتی چالیس پچاس برس کی عمر کا سامنے بیٹھا اپنی بیوی سے باتیں کر رہا ہے۔ مہ جمال کو پھر رونا آگیا اور اُس نے میواتی کی بیوی سے مخاطب ہو کر پوچھا: "میری اماں کہاں گئیں؟" میواتی نے کہا: "وہ مرگئی تھیں' اُن کو دفن کر دیا گیا۔ تم کو یہاں لائے ہیں۔ تم کچھ کھاؤ گی؟ لو کھیر پکی ہے' کھالو"

مہ جمال نے کہا: "مجھے بھوک نہیں ہے" اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ میواتن پاس آگئی اور اُس نے دلاسہ دینا شروع کیا اور کہا: "بیٹی! صبر کرو' رونے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تیری ماں زندہ نہیں ہوسکتی۔ ہمارے اولاد نہیں ہے' بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ اِس گھر کو اپنا گھر سمجھ' تو کون ہے' تیرا باپ کون ہے اور تو کہاں جاتی تھی؟"

مہ جمال نے کہا: "میں دہلی کے بادشاہ کے خاندان میں ہوں۔ میرے ابا جان گیارہ برس ہوئے مرگئے۔ ہم غدر کی بھاگڑ میں گھر سے نکلے تھے۔ نجف گڑھ میں ہمارے باغ کا مالی رہتا ہے۔ اُس کے گھر جانا چاہتے تھے کہ راستے میں پہلے فوج والوں نے لوٹا' پھر گوجروں نے اماں جان اور دو لونڈیوں مار ڈالا" کہتے کہتے وہ پھر رونے لگی۔

چند روز مہ جمال میواتن کے ہاں آرام سے دن گزارتی رہی۔ اگرچہ وہ پچھلے وقت کو یاد کر کے روتی تھی لیکن میواتن کی محبت کے سبب اُس کو کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ کچے پکائی روٹی مل جاتی تھی تاہم مہ جمال کو یہ گھر اور اس کی سادگی کاٹے کھاتی تھی اور وہ پچھلے زمانے کا عیش یاد آتا تھا۔ ایک رات کو مہ جمال' میواتن اور اُس کا خاوند اپنے مکان میں سوتے تھے کہ پڑوس کے چھپر میں آگ لگ گئی اور وہاں سے بڑھ کر اُن کے چھپر میں بھی آن لگی۔ دھوئیں کی بو سے مہ جمال کی آنکھ کھل گئی اور وہ چیختی ہوئی اُٹھی۔ میواتن اور میواتی کا کچھ زیور گھر کے اندر رکھا تھا' وہ اُس کو لینے

کیلئے اندر بھاگے اور مہ جمال گھر کے باہر بھاگی۔ کوٹھے کا جلتا ہوا چھپر گر پڑا اور وہ دونوں اُس کے اندر جل کر مر گئے۔ قصبے والوں نے بمشکل آگ بجھائی مگر مہ جمال کا یہ ٹھکانہ بھی خاک کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔

صبح جلی ہوئی لاشیں قصبے والوں نے دفن کیں اور مہ جمال کو ایک نمبردار اپنے گھر لے گیا۔ اُس کے کئی بچے اور دو بیویاں تھیں۔ مہ جمال کو ایک چارپائی سونے کو دے دی گئی۔ وہ دن تو گزر گیا۔ رات کو ایک بیوی نے کہا "اری لڑکی! دودھ چولہے پر رکھ دے۔ دوسری بولی: ہاں اری لڑکی اِدھر آ' میرے بچے کو سلا دے" ایک وقت میں دو حکم سُن کر مہ جمال ذرا گھبرا گئی۔ اُس نے نہ کبھی دودھ چولہے پر رکھا تھا اور نہ کسی بچے کو لوریاں دے کر سلایا تھا۔ تاہم وہ دودھ اُٹھا کر چولہے پر رکھنے چلی۔ چولہے کے قریب آ کر ٹھوکر لگی ہانڈی ہاتھ سے گر پڑی اور ٹوٹ گئی۔ دودھ سب بکھر گیا۔ آواز سُن کر نمبردار کی بیوی دوڑ کر آئی اور دودھ گرا ہوا دیکھ کر ایک تھپڑ مہ جمال کے مارا اور گالیاں دینا شروع کیں۔

مار کھانے اور گالیاں سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مہ جمال کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دودھ اُس کے کپڑوں پر بھی گرا تھا۔ وہ کبھی کپڑوں کو دیکھتی اور کبھی نمبردار کی بیوی کو دیکھتی جو لگاتار گالیاں بک رہی تھی۔

آخر وہ دیوار کے سہارے لگ کر کھڑی ہو گئی اور بے اختیار رونے لگی۔ مہ جمال کو روتا دیکھ کر نمبردار کی بیوی کو پھر غصہ آیا اور اُس نے جوتی نکال کر دو تین جوتیاں اُس کے چہرے پر ماریں اور کہا: "اب تو مجھ کو رو کر ڈراتی ہے۔ موئی ڈائن میواتن کو کھا گئی' اب یہاں کس کو کھانے آئی ہے۔ میرا سارا دودھ پھینک دیا' خدا رکھے میرے بچوں کو' دودھ کا چولہے کے سامنے گرنا بڑا منحوس ہوتا ہے۔ خبر نہیں تیرا آنا کیا مصیبت لائے گا"

مہ جمال کے چہرے پر جوتیاں پڑیں تو وہ بلبلا اُٹھی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اتنے میں نمبردار آ گیا اور اُس نے جو یہ شور و غل سنا تو وہ بھی وہاں آیا۔ مہ جمال وہاں سے بھاگ کر اپنی چارپائی کے پاس آ گئی۔ نمبردار اور اُس کی بیوی بھی دالان میں آ گئے۔ نمبردار نے بیوی سے پوچھا "کیا ہوا تھا" اُس نے سارا قصہ بیان کیا۔ اُس نے کہا کہ چلو خیر جانے دو۔ غریب عورت ہے' خطا ہو گئی' کچھ خیال نہ کرو۔ دوسری بولی "یہ غریب نہیں ہے' بڑی قطامہ ہے۔ میں نے آواز دی کہ ذرا بچے کو سلا دے تو کانوں میں بول مار کر چپ ہو گئی اور سنی اَن سنی کر دی۔ اِس کو تم

بیگم بنا کر لائے ہو یا نوکر بنا کر۔ نوکر ہے تو اِس کو کام کرنا پڑے گا"

نمبردار نے کہا "میں تو اِس کو لاوارث سمجھ کر لایا ہوں۔ اِس کو کام کرنا چاہیے۔ ہم کو ایک نوکر عورت کی ضرورت بھی تھی"

مہ جمال نے ڈرتے ڈرتے کہا: "مجھے ایسی نوکری کرنی نہیں آتی تھی' تم مجھ کو سکھا دو۔ تقدیر نے یہ وقت تو مجھ پر ڈالا مگر نوکری نہ سکھائی۔ میرے سامنے لونڈیاں کام کرتی تھیں۔ میں نے تو کبھی کچھ کام نہیں کیا" یہ کہتے کہتے اُس کو ایسا رونا آیا کہ ہچکی بندھ گئی۔

نمبردار نے کہا: "تو رو مت' رفتہ رفتہ سب کام آ جائے گا" اِس کے بعد کچھ کھانے کو دیا مگر مہ جمال سے کھایا نہ گیا اور وہ یوں ہی پڑ کر سو گئی۔ صبح کو نمبردار کی بیوی نے زور سے جھنجوڑا اور کہا: "اری اُٹھتی نہیں' کب تک سوئے گی۔ جھاڑو دینے کا وقت ہے"

مہ جمال کو یاد آیا کہ دلشاد نرگس اور سندری کس طرح جگایا کرتی تھیں۔ یا وہ وقت تھا یا یہ وقت ہے۔ ٹھنڈا سانس بھر کر اُٹھی اور حسبِ عادت دو چار انگڑیاں لیں۔

نمبردار کی بیوی نے دھکا دے کر کہا: "نحوست پھیلاتی ہے اُٹھتی نہیں" اُس وقت مہ جمال نے جانا کہ اب میں واقعی لونڈی بن گئی ہوں۔ شہزادی نہیں رہی' فوراً اُٹھی مگر آنسو لگاتار اُس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ نمبردار کی دوسری بیوی نے کہا: "اِس عورت کا گزر ہمارے گھر میں نہ ہوگا۔ ہر وقت روتی ہے۔ بال بچوں کے گھر میں اِس منحوس کا رکھنا اچھا نہیں" اتنے میں نمبردار آ گیا اور اُس نے بیویوں کے کہنے سے مہ جمال کو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دیا۔

مہ جمال حیران و پریشان کھڑی تھی اور کہتی تھی یا اللہ کدھر جاؤں۔ اتنے میں اُس کو اپنی مالن کا خیال آیا کہ وہ اِسی قصبے میں رہتی تھی اور اماں اُن کے ہاں ٹھہرنے کو گھر سے آئی تھیں۔

مہ جمال یہ خیال کر ہی رہی تھی کہ اتنے میں وہ کفنی والا فقیر سامنے آیا اور مہ جمال کو دیکھ کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ مہ جمال پر بھی اِس ناگہانی ملاقات کا بہت اثر ہوا اور وہ بھی کچھ گم سم سی ہو گئی۔ اگرچہ وہ ایسی مصیبت کی حالت میں تھی کہ اُس کو تن بدن کا ہوش نہ تھا تاہم فقیر اور اُس کی کفنی اور اُس کی زرد صورت اور [illegible] آنکھوں کا ایسا اثر اُس پر ہوا کہ تمام بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

فقیر نے کہا "میری ملکہ تم یہاں کہاں؟" مہ جمال نے [illegible] کا لفظ سنا تو لحاظ سے منہ پھیر [illegible] کہا "مجھ کو تقدیر یہاں پر لے آئی ہے" اور پھر [illegible] قصہ بیان کیا۔ اُس نے کہا "میری [illegible]

تو قریب ہے مگر میں نے کبھی تمہارا حال نہ سنا۔ چلئے میرے گھر پر چلئے"

مہ جمال اُس کے پیچھے پیچھے چلی۔ وہ اپنے گھر میں گیا اور مالن سے مہ جمال کا حال کہا۔ وہ دوڑی ہوئی آئی اور مہ جمال کے قدموں میں گر پڑی اور پروانوں کی طرح اِس پر قربان ہونے لگی۔ اِس کے بعد بڑی عزت سے چارپائی پر لے جا کر بٹھایا اور حالات پوچھتی رہی: "بیگم! یہ گھر آپ کا ہے۔ میرا بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کے گھر کی بدولت خدا نے مالا مال کر رکھا ہے۔ اب آپ اِس گھر کی مالک ہیں۔ میں اور میرا بیٹا آپ کے لونڈی غلام ہیں"

مالن نے اپنی حیثیت کے موافق اِس قدر آرام مہ جمال کو پہنچایا کہ وہ مصیبتوں کو بھول گئی۔ اُس نے دیکھا کہ مالن کے لڑکے کے پاس دُور دُور سے بیمار آتے ہیں اور وہ پہلے اپنی کفنی پر ہاتھ ملتا ہے۔ پھر اپنے دونوں رخساروں پر اُن کو رکھتا ہے اور آنکھیں کچھ دیر بند رکھ کر پھر کھول دیتا ہے اور کہتا ہے: "جاؤ! تم اچھے ہو" سب بیمار آن کی آن میں اچھے ہو جاتے ہیں۔

مہ جمال کئی روز تک یہ تماشا دیکھتی رہی تو اُس نے مالن سے پوچھا: "تیرے لڑکے میں یہ طاقت کہاں سے آ گئی؟ اُس نے مجھ کو بھی ایک دن میں اِسی طرح اچھا کر دیا تھا"

مالن نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "بی بی جان کی امان پاؤں تو کہوں" مہ جمال نے کہا: "اب میں جان کی امان دینے کے قابل نہیں ہوں۔ تم کہو مجھے اِس بھید کے معلوم کرنے کا شوق ہے"

مالن نے کہا: "بی بی! میرے لڑکے کو تم سے محبت ہو گئی تھی اور تمہارے فراق میں اِس نے بہت دُکھ اُٹھائے۔ آخر ایک فقیر نے اِس کو یہ کفنی دی۔ یہ اِسی کی برکت ہے جس سے ہزاروں کو فیض پہنچ رہا ہے اور خدا نے گھر بیٹھے تم کو بھی یہاں بھیج دیا"

مہ جمال پر اِس خبر کا بہت اثر ہوا اور کچھ دن کے بعد اُس نے مالن سے کہہ کر قاضی کو بلوایا اور کفنی پوش سے نکاح کر لیا۔

مالن نے تمام عمر مہ جمال کی ایسی خدمت کی اور ایسی محبت سے رکھا کہ وہ کہتی تھی کہ مجھ کو اپنا بچپن بھی یاد نہیں آتا۔ مگر مالن کے لڑکے نے کفنی پہننا کبھی ترک نہ کیا اور اِس کفنی کا فیض دُور دُور مشہور ہو گیا اور اِس طرح مہ جمال کی سوتی قسمت کفنی نے جگا دی۔

☆☆☆☆☆

دکھیا شہزادی کی کہانی

(ننھی شہزادی کے دو ہاتھ لیڈی ہارڈنگ کی تصویر پر)

اماں! یہ مورت اُنہی وائسرانی کی ہے جنہوں نے ہم کو ایک ہزار روپے دیئے ہیں؟

ہاں بیٹی! یہ بڑے لاٹ صاحب کی بیوی کا فوٹو ہے' بڑی رحم دل ہیں' ہمیشہ غریبوں پر ترس کھایا کرتی ہیں۔ اب کے ہم بے سہاروں کا بھی خیال آ گیا۔

ذرا اِس تصویر کو مجھے دینا۔ میں اِن بیگم کی بلائیں لوں' واری جاؤں اور دو باتیں کر کے جی کی بھڑاس نکالوں:

میں صدقے' تم بڑی اچھی آدمی ہو۔ میں قربان کیا نورانی صورت ہے۔ مگر ہم غریبوں کے جھونپڑے میں کیوں کر آئیں۔ ہمارے ہاں تو ٹوٹے بوریہ کا فرش بھی پورا نہیں ہے۔ میں تم کو کہاں بٹھاؤں۔ ہم کو چارپائی بھی میسر نہیں۔ ہم سب زمین پر سوتے ہیں۔ یہ بہت ٹھنڈی ہے۔ تم کو نزلہ نہ ہو جائے۔ ہمارے مکان کی کڑیاں بھی جھکی ہوئی ہیں' ایسا نہ ہو گر پڑیں۔ میں تمہاری خاطر کیا کروں۔ کیا چیز دسترخوان پر چنوں۔ پرسوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا۔ ابا میاں کو بنئے نے آٹا قرض نہیں دیا۔ اِس وقت بھوک کے مارے عجب حالت ہے۔ اگر گھر میں کچھ ہوتا تو میں سب تمہارے سامنے رکھ دیتی۔ میں بھوکی رہتی اور تم کو کھلاتی۔ کیونکہ تم نے ہم پر احسان کیا ہے اور اُس وقت ہم کو یاد کیا ہے جبکہ سارا جہاں ہم کو بھول گیا تھا

کیوں بیگم! تمہارا جی اِس اندھیرے گھر میں نہیں گھبراتا۔ تم بجلی کی روشنیوں میں رہتی ہو۔ کیا کروں' ہم کو مٹی کا چراغ بھی نصیب نہیں' ورنہ اِس کو روشن کر دیتی۔

تم کو کہاں سلاؤں۔ رات کیوں کر گزرے گی۔ ہمارے پاس فقط دو پھٹے ہوئے کمبل ہیں۔ ایک ابا میاں اُوڑھتے ہیں اور ایک میں میری اماں مجھ کو ساتھ لے کر سوتی ہیں۔

میرے پیارے لاٹ صاحب کی بیگم! اچھی ذرا میرے ہاتھوں اور منہ کو دیکھو' سردی سے پھٹ گئے ہیں۔ سردی کی راتیں پہاڑ ہوتی ہیں۔ سکھ کی نیند ہمارے خواب میں بھی نہیں آتی۔ تم نے ہم کو ہزار روپے دیئے ہیں۔ میں ہزار ہا بار اپنے ہاتھوں سے تمہاری چٹ پٹ بلائیں لوں۔ اماں کہتی ہیں کہ ایک زمانہ ہمارا بھی تھا۔ ہم بھی ہزاروں روپے غریبوں محتاجوں کو بانٹا کرتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی اونی قالین اور مخملی فرش تھے' ریشمی زریں پردے تھے' سونے چاندی کی جڑاؤ چھتیں تھیں' شال دوشالے تھے' لونڈی غلام تھے' محل تھے' ہندوستان کی شہنشاہی میں داخل تھے۔

ہمارے سامنے بھی گردنیں جھکتی تھیں۔ راجہ مہاراجہ اشارہ کے منتظر رہتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ ہم بھی لاچار اور بے سہاروں پر ترس کھایا کرتے تھے۔ دوسروں کی خاطر اپنا گھر لٹاتے تھے۔ ہمارے جلوس میں بھی نقارے بجتے تھے' نقیب کڑ کتے تھے' ہاتھی جھوم جھوم کر چلتے تھے۔ ہمارے سر پر بھی تاج تھا۔ تلواریں ہمارے قدموں پر سر ٹیک کر چلتی تھیں۔ توپیں ہماری ہوں پر گرج گرج کر برستی تھیں۔ لیکن بیگم اب وقت کہاں ہے۔ دنیا ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے:

اُونچے مکان تھے جن کے بڑے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے
استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے
باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

خدا نے ہم کو نعمت دی۔ جب تک اس کے قابل رہے' نعمت پاس رہی اور جب ہمارے عمل خراب ہوئے' عیش وعشرت میں پڑ گئے' ملک سے بے خبر ہو گئے' مظلوموں کو بھول گئے' ظالموں کی جب زبانوں پہ چھوں گئے' خدا نے وہ دولت چھین لی اور دوسروں کو دے دی۔ ہم کو اِن میں کسی سے شکوہ نہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

ہاں تم میری ماں کی برابری بلکہ اُن سے بھی بڑی ہو۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ یہاں بھی نہ بولوں تو کہاں زبان کھولوں۔ خدا نے تم کو ہم سب کا رکھوالا بنایا ہے۔ دیکھو تو بھوک پیاس ہم کو ستاتی ہے۔ ہمارے ایسیلے دن خاک میں ملاتی ہے۔ میری عمر ایسی تھی کہ چہرہ لال ہوتا مگر فاقوں نے زرد کر دیا ہے۔ ہمارے گھر میں بقر عید کی خوشی بھی نہیں آتی۔ ہم کو ان دنوں میں بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ ہم اِس دن بھی ٹوٹی ہوئی جوتیاں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں جس دن ساری دنیا اپنی اپنی حیثیت کے بموجب نئی جوتیاں اور کپڑے پہنتی ہے۔ ہم کو برسات کے ٹپکے کے کھٹکے رات دن رُلاتے ہیں۔ ہم کو سردیاں جلانے آتی ہیں۔ ہم پر گرمیاں قیامت ڈھاتی ہیں۔

دلی شہر کے کتے پیٹ بھر کر سوتے ہیں۔ کوے شکم سیر ہو کر گھونسلوں میں جاتے ہیں۔ چڑیوں تک کے واسطے پکی چھتوں کے گھر ہیں۔ گلہریاں بھی شاندار مکانوں میں رہتی ہیں مگر تیمور بادشاہ کی اولاد' شاہجہان بادشاہ کے بچے جنھوں نے اِس شہر کو فتح کیا اور بنایا' آدھی روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہوئے بھوکے سوتے ہیں۔ اُن کو کوئی رات بے فکری کی نصیب نہیں ہوتی۔ جن کے باپ دادا نے لال قلعہ بنایا تھا' اُن کو ٹوٹا جھونپڑا بھی میسر نہیں آتا۔

بیگم! تم نے دیکھا ہوگا' دلی شہر میں ایک جامع مسجد ہے جس کو ہمارے دادا شاہجہان نے بنایا تھا۔ دور دور کی خلقت اِس کو دیکھنے آتی ہے مگر اِس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے' پھٹے ہوئے برقعہ کے اندر' ناتواں بچہ کو گود میں لئے' پیوند لگا پاجامہ اور گھسی ہوئی کنے لگی جوتی پہنے کون عورت بھیک مانگتی ہے۔ بیگم! یہ غریب دکھیا بیوہ شہزادی ہے جس کا کوئی وارث نہیں رہا۔ تم یقین کرنا میری رحم دل وایسرائنی! اِسی کے باپ شاہجہان نے یہ مسجد بنوائی تھی۔ آج پیٹ کیلئے بھیک کے ٹکڑے ٹکڑے جمع کر رہی ہے تاکہ زندگی کی مسجد آباد کرے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں تم سے کیوں کر کہوں کہ یہ ہزار روپے بہت تھوڑے ہیں۔ مرہم کے ایک چھوٹے سے پھاہے سے کیا ہوگا' ہمارے تو سارے بدن پر زخم ہیں۔

تمہاری نئی دلی کی خیر جس کی سڑکوں پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ تمہاری نئی عمارتوں کی خیر جن کے واسطے کروڑوں روپے کی منظوری ہے۔ تمہارے اِس نیک خیال کی خیر جس کی بدولت دلی کی پرانی عمارتوں کی مرمت ہو رہی ہے اور بے شمار روپیہ اِس میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے پیٹ نامراد سڑکوں کی بھی مرمت کرا دو اور ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں پر بھی عمارتیں

چنواد و' ہم بھی پرانے زمانے کی نشانیاں ہیں۔ ہم کو بھی زندہ آثار قدیم میں لوگ سمجھتے ہیں' ہم کو بھی سہارا دو' مٹنے سے بچاؤ۔ خدا تم کو سہارا دے گا اور بچائے گا۔

یہ کہتے کہتے دکھیا شہزادی چونکی' آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو دونوں ہاتھ سے ملا اور کہا میں بھی کیا دیوانی ہوں' تصویر سے باتیں کرتی ہوں' کاغذی بت کے آگے مرادیں مانتی ہوں مگر شاید کسی خدا کے بندے کے کان تک یہ دیوانہ پن کی باتیں پہنچ جائیں اور وہ انگریزی میں ترجمہ کر کے خدا ترس ہارڈنگ بیگم کو سنا دے اور وہ اپنے خاوند لاٹ صاحب سے کہیں' کونسل کے ممبروں سے کہیں' بادشاہ سلامت اور اُن کی ملکہ سے کہیں کہ آل شاہجہان کی حفاظت کیلئے بھی نئی دہلی کی دیگر منظوریوں کے ساتھ کوئی شاندار اور مصیبت شکن منظوری ہونی چاہیے

دکھیا شہزادی کی کہانی

جس ننھی شہزادی کا یہ خیالی قصہ لکھا گیا ہے' اُس کی ماں پر غدر کے زمانہ میں بڑی بپتا پڑی تھی۔ اِس لئے وہ سچا اور اصلی قصہ بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ غدر میں میری عمر سات برس کی تھی۔ اماں مجھ کو تین برس کا چھوڑ کر مر گئی تھی۔ ابا کے پاس رہتی تھی۔ چودہ برس کا میرا ایک بھائی جمشید شاہ نامی تھا مگر ہاتھ پاؤں کی اُٹھان سے بیس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ ابا جان نابینا ہو گئے تھے اور ہمیشہ گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ڈیوڑھی پر چار نوکر اور ایک داروغہ' گھر میں تین باندیاں اور ایک مغلانی کام کرتی تھیں۔ حضرت بہادر شاہ ہمارے رشتے کے دادا ہوتے تھے اور ہمارا سب خرچ شاہی خزانہ سے ملتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک بکری پلی ہوئی تھی۔ ایک دن میں نے اُس کے بچہ کو ستانا شروع کیا۔ بکری نے بگڑ کر میرے ٹکر ماردی۔ میں نے غصہ میں دست پناہ گرم کر کے بکری کے بچہ کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں' وہ بچہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

کچھ دن کے بعد غدر پڑا۔ بادشاہ کے نکلنے کے بعد ہم بھی ابا کے ساتھ شہر سے نکلے' پالکی میں سوار تھے اور جمشید بھائی گھوڑے پر ساتھ ساتھ تھے۔ دلی دروازے سے نکلتے ہی فوج والوں نے پالکی پکڑی۔ بھائی کو گرفتار کرنا چاہا۔ اُنہوں نے تلوار چلائی' ایک افسر کو زخمی کیا' آخر زخموں سے چور ہو کر گرے۔ سامنے دو نوک دار پتھر پڑے تھے' وہ آنکھوں میں کھب گئے اور بھائی نے چیخیں مار مار کر تھوڑی دیر میں جان دے دی۔ بھائی کی بے قرار آواز سُن کر ابا میاں بھی پالکی سے نیچے اُتر آئے اور ٹٹول ٹٹول کر لاش کے پاس گئے اور پتھر سے سر ٹکرا کر لہولہان کر لیا یہاں تک کہ اُن کا وہیں خاتمہ

ہو گیا۔

اِس کے بعد فوج والوں نے ہمارا سب سامان لے لیا اور مجھ کو بھی پکڑ لیا۔ چلتے وقت باپ اور بھائی کی لاش سے چمٹ کر خوب روئی اور اُن کو بے گور و کفن چھوڑ کر مجبوراً فوج کے ساتھ چلی گئی۔ ایک دیسی سپاہی نے افسر سے مجھ مانگ لیا اور اپنے گھر مجھ کو لے گیا جو پٹیالہ کی ریاست میں تھا۔ اُس سپاہی کی بیوی بڑی بدمزاج تھی۔ وہ مجھ سے برتن منجھواتی' مصالحہ پسواتی' جھاڑو دلواتی اور رات کو پاؤں کو دبواتی۔

شروع شروع میں ایک رات دن بھر کی محنت سے تھک گئی تھی۔ پاؤں دبانے میں اُونگھ آئی تو اُس جلاد نے دست پناہ گرم کر کے میری بھنوؤں پر رکھ دیا جس سے پلکیں تک جھلس گئیں اور بھنوؤں کی چربی نکل آئی۔ میں نے ابا کو پکارنا شروع کیا کیونکہ مجھے اتنی سمجھ نہ تھی کہ مرنے کے بعد پھر کوئی نہیں آیا کرتا۔ جب ابا نے جواب نہ دیا تو میں اُس عورت کے ڈر سے سہم کر چپ ہو گئی۔ لیکن اُس کو اِس پر بھی ترس نہ آیا اور بولی کہ پاؤں دبا۔ زخموں کی تکلیف میں مجھ کو نیند نہ آتی تھی اور پیر بھی نہ دب سکتے تھے مگر قہر درویش بر جان درویش' میں نے اِسی حالت میں پاؤں دبائے۔ سویرے مصالحہ پیسنے میں مرچوں کا ہاتھ زخم کو لگ گیا۔ اُس وقت مجھ کو تاب نہ رہی اور زمین پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ مگر بے رحم عورت کو تب بھی کچھ خیال نہ آیا اور بولی چل مکار کام سے دم چراتی ہے۔ یہ کہہ کر پسی ہوئی مرچیں زخموں پر مل دیں۔ اُس وقت مجھ کو مارے تکلیف کے غش آ گیا اور رات تک ہوش نہ آیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو بیچارا سپاہی میرے زخموں کو صاف کر کے دوا لگا رہا تھا۔

تھوڑی دن کے بعد سپاہی کی یہ بیوی مر گئی اور اُس نے نئی شادی کی جو مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اُسی کے گھر میں جوان ہوئی اور اُس نے میری شادی ایک غریب آدمی سے کر دی۔ دو برس تک میرا خاوند زندہ رہا۔ اِس کے بعد مر گیا۔ بیوہ ہو کر میں دلی چلی آئی کیونکہ وہ سپاہی بھی مر گیا تھا اور اُس کی بیوہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ دہلی میں آ کر میں نے بھی اپنی قوم میں دوسری شادی کر لی جس سے فقط ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

اِس خاوند کے پانچ روپے ماہوار انگریز سرکار سے پنشن ملتی تھی مگر تنخواہ قرضہ میں چلی گئی اور اب ہم نہایت عسرت اور تنگ دستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فاقہ میں روزہ

(دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ)

جب دلّی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی' لال قلعہ پر تیموریوں کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ اُنہیں دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر (جو ابوظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے اور غدر سے پہلے ایک اتفاقی قصور کے سبب قید ہو کر الٰہ آباد چلے گئے تھے) اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ مرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر میں مغموم واپس آئے۔ ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا: خیر باشد مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔ مرزا نے مسکرا کر جواب دیا: نہیں کچھ نہیں' بعض اوقات اماں حضرت خوامخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت تحسین خاں گویا گا رہا تھا اور میرا دل بہلا رہا تھا۔ اُس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں' اُن کو یہ شور وغل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان میں گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریحی عادت کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا مگر اس کی پابندی سے جی اُلجھتا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ سولہ دن کیوں کر بسر ہوں گے۔

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: حضور! یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے۔ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد میں تشریف لے چلئے' عجیب بہار ہوتی ہے۔ رنگ برنگ کے آدمی' طرح طرح کے جمگھٹے دیکھنے میں آئیں گے۔ خدا کے دن ہیں خدا والوں کی بہار بھی دیکھئے۔

مرزا نے اس اصلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مصاحبوں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جا کر عجب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں۔ کہیں قرآن شریف کے دَور ہو رہے

ہیں۔ رات کو قرآن سنانے والے حفاظ ایک دوسرے کو قرآن سنا رہے ہیں۔ کہیں مسائل دین پر گفتگو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلے پر بحث کرتے ہیں اور بیسیوں آدمی گرد میں بیٹھے مزے سے سن رہے ہیں۔ کسی جگہ توجہ اور مراقبہ کا حلقہ ہے۔ کہیں صاحب وظائف میں مشغول ہیں۔ الغرض مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔

کل جدید لذیذ مرزا کو یہ نظارہ بہت پسند آیا اور وقت لطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا وقت قریب آیا۔ سینکڑوں خوان افطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محل سلطانی سے متعدد خوان مکلف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے تاکہ روزہ داروں میں افطاری تقسیم کی جائے۔ اس کے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب امراء علیحدہ افطاری کے سامان بھیجتے تھے۔ اس لئے اُن خوانوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ چونکہ ہر امیر کوشش کرتا تھا کہ اُس کا سامان افطاری دوسروں سے بڑھ کر رہے' اس لیے ریشمی رنگ برنگ کے خوان پوش اور اُن پر مقیشی جھالریں ایک سے ایک بڑھ کر ہوتی تھیں اور مسجد میں اُن کی عجب آرائش ہو جاتی تھی۔

مرزا کے دل پر اس دینی چہل پہل اور شان وشوکت نے بڑا اثر ڈالا اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ گھروں میں وہ دیکھتے کہ سینکڑوں فقراء کو سحری اور اول شب کا کھانا روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوایا جاتا تھا اور باوجود رات دن کے لہو ولعب کے یہ دن اُن کے گھر میں بڑی برکت اور چہل پہل کے معلوم ہوتے تھے۔

مرزا سلیم کے ایک بھانجے شہ زور نو عمری کے سبب اکثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا جو آج خواب وخیال کی طرح یاد آتا ہے اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیروزبر ہو گئی۔ قلعہ برباد ہو گیا۔ امیروں کو پھانسیاں مل گئیں۔ اُن کے گھر اُکھڑ گئے۔ اُن کی بیگمات ماماگیری کرنے لگیں اور مسلمانوں کی سب شان وشوکت تاراج ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولہے بنے ہوئے ہیں۔ سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ گھوڑوں کے دانے دلے جا رہے ہیں۔ گھاس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہجہان کی خوبصورت اور بے مثل مسجد اصطبل نظر آتی ہے اور پھر جب مسجد واگذاشت ہو گئی اور سرکار نے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر جانا ہوا۔ دیکھا کہ چند مسلمان میلے کچیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے

ہیں۔ دو چار قرآن شریف کا ورد کر رہے ہیں اور کچھ اِسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دیئے' کسی نے ترکاری کے قتلے تقسیم کر دیئے۔ نہ وہ اگلا سا سامان نہ وہ اگلی سی چہل پہل نہ وہ پہلی سی شان و شوکت' یہ معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ اِس کے بعد آج کل کا زمانہ بھی دیکھا جبکہ مسلمان چاروں طرف سے دب گئے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان تو مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غرباء آئے تو اُن سے رونق کیا خاک ہو سکتی ہے۔ پھر غنیمت ہے کہ مسجد آباد رہے۔ اگر مسلمانوں کے افلاس کا یہی عالم رہا تو آئندہ خبر نہیں کہ کیا نوبت آئے۔

مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ ایک دن میں نے اُن سے غدر کا قصہ اور تباہی کا فسانہ سننا چاہا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اِس کے بیان کرنے میں عذر و مجبوری ظاہر کرنے لگے۔ لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اپنی دردناک کہانی اِس طرح سنائی:

جب انگریزی توپوں نے' کرچوں نے اور سنگینوں نے' چکمانہ توڑ جوڑ نے' ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ تاج سر سے اُتار لیا۔ تخت پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں آتش ناک گولیوں کا مینہ برس چکا۔ سات پردوں میں رہنے والیاں بے چادر ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں۔ چھوٹے بن باپ کے بچے ابا ابا پکارتے ہوئے بے یار و مددگار پھرنے لگے۔ حضور ظلِ سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا' قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اُس وقت میں نے بھی بوڑھی والدہ' کمسن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لے کر اور اُجڑے ہوئے قافلے کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں پر سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولان گاہ بنا ہوا ہے۔ اِس لئے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو قیام کیا۔ اِس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق و دق جنگل' تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی' ایک بڑھاپے سے لاچار' دو قدم چلنا دشوار' دوسری حاملہ اور بیمار' تیسری دس برس کی معصوم لڑکی زار و نزار۔ عورتیں روتی تھیں اور بیان کر کر کے روتی تھیں۔ میرا کلیجہ اُن کے بیان سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں الٰہی ہم کہاں جائیں' کس کا سہارا ڈھونڈیں' ہمارا تاج و تخت لٹ گیا' تو ٹوٹا بوریا اور امن کی جگہ تو دے' اِس بیمار پیٹ والی کو کہاں لے

کر بیٹھوں' اِس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں' جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں' کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ہم سب کا منہ تکتی تھی۔ مجھ کو اُس کی معصومانہ بے کسی پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر مجبوراً میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا۔ غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب وہ یہ کہتیں:

"تقدیر اُن کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارے تھے۔ قسمت نے اُن کو بے بس کر دیا جو بیکسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیز کی نسل ہیں جن کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہریاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہان کے گھر والے ہیں جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھا دی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنا دی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے' زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانہ نہیں ملتا' وہ کیوں سرکشی کرتی ہے۔ آج ہم پر مصیبت ہے' آج ہم پر آسمان روتا ہے"

تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ القصہ بہ ہزار وقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا۔ اُنہوں نے ہماری خاطر کی اور اپنی چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرایا۔

کچھ روز تو اِن مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرائے رکھا لیکن کب تک یہ بار اُٹھا سکتے تھے' اُکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میاں جی چوپاڑ میں ایک برات آنے والی ہے تو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن ٹھالی (بیکار) بیٹھے کیا کرے ہے' کچھ کام کیوں نہیں کرتا۔ میں نے کہا: بھائی جہاں تم کہو گے وہیں جا پڑیں گے' ہمیں چوپاڑ میں رہنے کی ہوس نہیں' جب فلک نے عالیشان محل چھین لئے تو اِس کچے مکان میں ہم کیا ضد کریں گے اور رہی کام کرنے کی بات سو میرا جی تو خود گھبراتا ہے' خالی بیٹھے ہوئے طبیعت اُکتائی ہوئی جاتی ہے' مجھ کو کوئی کام بتاؤ۔ ہو سکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔ اُن کا چوہدری بولا: ہم نے کے بیرا (ہمیں کیا خبر) کہ تو کے کام (کیا کام) کر سکے ہے۔ میں نے جواب دیا: میں سپاہی زادہ تیغ تفنگ چلانا میرا ہنر ہے۔ اِس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔ گنوار ہنس کر کہنے لگے: نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہوگا' گھاس کھودنی پڑے گی' ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں۔ گنواروں کے اِس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جواب دیا کہ بھائیو مجھ کو تو ہل چلانا اور گھاس

کھودنی نہیں آتی۔ مجھ کو روتا دیکھ کر گنواروں کو رحم آ گیا اور بولے: اچھا تو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں۔ فصل پر تجھ کو اناج سے دیا کریں گے جو تجھ کو برس دن کو کافی ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور اُڑایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینہ آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا۔ میری اہلیہ اور بہن کو بھی بخار نے آن دبایا۔ وہ گاؤں وہاں دوا اور حکیم کا کیا ذکر۔ خود لوٹ پیٹ کر اچھے ہو جاتے ہیں مگر ہم کو دواؤں کی عادت تھی' سخت تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک روز اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہو گیا۔ گاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اُس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہو گئی۔ چونکہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا اس لئے ہماری عورتوں کی چارپائیاں بالکل غرق وآب ہو گئیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلیوں میں دو چار چارپائیاں اڑا کر عورتوں کو اُن پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اُتر گیا مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اُوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔ پچھلی رات میری بیوی کے دردِ زہ شروع ہوا اور ساتھ ہی جاڑے سے بخار بھی آیا۔ اُس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اندھیرا گھپ' مینہ کی جھڑی' کپڑے سب گیلے' آگ کا سامان ناممکن۔ حیران تھے کہ الٰہی کیا انتظام کیا جائے۔ درد بڑھنا شروع ہوا اور مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہو گئی یہاں تک کہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔ بچہ پیٹ میں ہی رہا۔

چونکہ وہ ساری عمر ناز و نعمت میں پلی تھیں' غدر کی مصیبتیں ہی اُن کی ہلاکت کیلئے کافی تھیں۔ خیر اُس وقت تو جان بچ گئی مگر یہ بعد کا جھٹکا تو ایسا بڑا لگا کہ جان لے کر گیا۔

صبح ہوئی' گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو اُنہوں نے کفن وغیرہ منگوایا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گورِ غریباں میں ہمیشہ کیلئے جا سوئی۔

اب ہم کو کھانے کی فکر ہوئی کیونکہ اناج سب بھیگ کر سڑ گیا تھا۔ گاؤں والوں سے بھی مانگتے ہوئے لحاظ آتا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اِسی مصیبت میں گرفتار تھے۔

تاہم بیچارے گاؤں کے چوہدری کو خود ہی خیال ہوا اور اُس نے قطب صاحب سے ایک روپیہ کا آٹا منگوا دیا۔ وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہوگا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا۔ والدہ صاحب کا دل بہت نازک تھا۔ وہ ہر وقت گذشتہ زمانہ کو یاد کیا کرتی تھیں' رمضان کا چاند دیکھ کر اُنہوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ اُن کو اگلا وقت یاد آ گیا ہے۔ تسلی

کی باتیں کرنے لگا جس سے اُن کو کچھ ڈھارس ہو گئی۔

چار پانچ دن تو آرام سے گزر گئے مگر جب آٹا ختم ہو چکا تو بڑی مشکل درپیش ہوئی۔ سوال کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا' بھوک کے مارے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اِس قسم کی تکلیف کے وقت بیان کر کے رویا کرتی تھیں مگر آج بڑے اطمینان سے خاموش تھیں۔ اُن کی خاموشی واطمینان سے میرے دل کو سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں' دلاسا دینے لگا۔ وہ معصوم بھی میرے سمجھانے سے نڈھال ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے' بس ایک غوطہ سا تھا۔

اِس غوطہ اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آ گیا۔ والدہ صاحبہ اُٹھیں اور تہجد کی نماز کے بعد جن دردناک الفاظ میں اُنہوں نے دعا مانگی اُن کا نقل کرنا محال ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ اُنہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

"ہم نے ایسا کیا قصور کیا ہے جس کی سزا یہ مل رہی ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے گھروں سے سینکڑوں محتاجوں کو کھانا ملتا تھا اور آج ہم خود دانے دانے کو محتاج ہیں اور روزہ پر روزہ رکھتے ہیں۔ خداوندا! اگر ہم سے قصور ہوا ہے تو اِس معصوم بچی نے کیا خطا کی جس کے منہ میں کل سے کھیل اُڑ کر نہیں گئی"

دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور فاقہ میں روزہ پر روزہ رکھا۔ شام کے قریب چوہدری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا "آج نیاز تھی' یہ اِس کا کھانا ہے اور پانچ روپیہ زکوٰۃ کے ہیں۔ ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں مگر اب کے نقد دیا ہے۔

یہ کھانا اور روپے مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئی کہ گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکرانہ بھیجتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردشِ فلاکت نے مرد کے خیال پر تو اثر ڈال دیا لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی قدیمی غیرت داری پر قائم ہے۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے اُنہوں نے تیور بدل کر کہا: تف ہے تیری غیرت پر' خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اِس سے مرجانا بہتر تھا۔ اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مرجانا یا

مارڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے' صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔

والدہ کے اِن باتوں سے مجھے پسینہ آگیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ چاہا کہ اُٹھ کر یہ چیزیں واپس کرآؤں مگر والدہ نے روکا اور کہا: خدا ہی کو یہ منظور ہے تو ہم کیا کریں' سب کچھ سہنا ہوگا۔ یہ کہہ کر کھانا رکھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد ہم سب نے مل کر کھالیا۔ پانچ روپیہ کا آٹا منگوالیا جس سے رمضان بخیر وخوبی سے بسر ہوگیا۔

اِس کے بعد چھ مہینے گاؤں میں اور رہے' پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر والدہ کا انتقال ہوگیا اور بہن کی شادی کردی۔ انگریزی سرکاری نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کردی جس پر آج کل زندگی کا انحصار ہے۔

☆☆☆☆☆

بیچاری شہزادی کا خاکی چھپر کھٹ

گل بانو خدا رکھے پندرہ برس کی ہوئیں۔ جوانی کی راتوں نے گود میں لینا شروع کیا۔ مرادوں کے دن پہلو میں گدگدیاں کرنے لگے۔ میرزا دارا بخت بہادر ولی عہد سابق بہادر شاہ کی نور چشم ہیں۔ باپ نے بڑے چاؤ چو چلے سے پالا ہے اور جس دن سے وہ دنیا کو چھوڑ کر قبر میں گئے' محل میں گل بانو کی ناز برداریاں پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگیں۔ اماں کہتی ہیں' نگوڑی کے ننھے سے دل کو بہت صدمہ پہنچا ہے' باپ کا ہڑکا نہ کرے۔ اِس کی ایسی دلداری کرو کہ اُن کی محبتوں کو بھول جائے۔

اِدھر دادا یعنی بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم ہے کہ پوتی کے لاڈ میں کسی بات سے دریغ نہیں کرتے۔ نواب زینت محل اُن کی لاڈلی اور منظور نظر بیوی ہیں۔ جواں بخت اُنہی کے پیٹ کا شہزادہ ہے۔ اگر چہ میرزا دارا بخت کے قبل از وقت مرجانے سے ولی عہد کا منصب میرزا فخرو کو ملا ہے مگر جواں بخت کی محبتوں کے سامنے ولی عہد کی بھی کچھ پرستش نہیں ہے اور زینت محل انگریزی حکام سے اندر ہی اندر جواں بخت کی تخت نشینی کے معاملات طے کررہی ہیں۔ جواں بخت کی اِس دھوم سے شادی ہوتی ہے کہ مغلوں کی آخری تاریخ میں اِس کروفر کی نظیر نہیں ملتی۔ غالب وذوق سہرے لکھتے ہیں' اور اُن میں وہ مشہور شعر بازی کی چشمک ہوجاتی ہے' جس کا ذکر شمس العلماء آزاد دہلوی نے ''آبِ حیات'' میں کیا ہے اور غالب کو لکھنا پڑتا ہے کہ: ''مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات'' ورنہ مجھے خدانخواستہ استاد شاہ یعنی جناب ذوق سے کچھ عداوت نہیں ہے۔

یہ سب کچھ تھا اور جواں بخت اور زینت محل کے آگے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا مگر گل بانو کی بات سب سے نرالی تھی۔ بہادر شاہ کو اِس لڑکی سے جو تعلق تھا اور جیسی کچی محبت اِس یتیم لڑکی سے رکھتے تھے' ایسی کیفیت زینت محل اور جواں بخت کو بھی میسر نہ تھی۔

پس اندازہ ہوسکتا ہے کہ گل بانو کس شان و شوکت و ناز و نعمت سے زندگی بسر کرتی ہوں گی۔

ہونے کو میرزا دارا بخت کے اور بھی بال بچے تھے مگر گل بانو اور اُس کی والدہ سے اُن کو عشق تھا۔ گل بانو کی ماں ایک ڈومنی تھی اور میرزا اِس کو تمام بیگمات سے زیادہ چاہتے تھے۔ جب وہ مرے تو گل بانو بارہ سال کی تھی۔ میرزا درگاہ حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلوی میں دفن ہوئے تھے جو دہلی سے چھ میل کے فاصلہ پر پرانی دہلی کے کھنڈروں میں واقع ہے۔ گل بانو' مہینے ماں کو لے کر باپ کی قبر دیکھنے جایا کرتی تھی۔ جب جاتیں' قبر سے لپٹ کر روتیں اور کہتیں: ''ابا! ہم کو بھی اپنے پاس لٹا کر سلا لو' ہمارا جی تم بن گھبراتا ہے''

جب گل بانو نے پندرہویں سال میں قدم رکھا تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں مگر دلربائی کی شوخیاں اِس ستم کی ڈھائیں کہ محل کا بچہ بچہ پناہ مانگتا تھا۔ سونے کے چھپر کھٹ میں دوشالہ تانے سویا کرتی تھیں۔ شام کے چراغ جلے اور بانو چھپر کھٹ پر پہنچیں۔ ماں کہتیں: چراغ میں بتی پڑی لاڈو پلنگ چڑھی تو وہ مسکرا کر انگڑائی اور جمائی لے کر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتیں: اچھا بی تم کو کیا' سوتے ہیں وقت کھوتے ہیں' تمہارا کیا لیتے ہیں۔ تم ناحق کوئلوں پر لوٹی جاتی ہو۔ ماں کہتی: نابنو میں جلتی نہیں شوق سے آرام کرو۔ خدا تم کو ہمیشہ سکھ نیند سلاتا رکھے۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ زیادہ سونا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے۔ تم شام کو سوتی ہو تو سویرے ذرا جلدی اُٹھا کرو۔ مگر تمہارا تو یہ حال ہے کہ دس بجے جاتے ہیں' گھر میں دھوپ پھیل جاتی ہے۔ لونڈیاں ڈر کے مارے بات نہیں کر سکتیں کہ بانو کی آنکھ کھل جائے گی۔ ایسا بھی کیا سونا۔ آدمی کو کچھ گھر کا کام بھی دیکھنا چاہیے۔ اب ماشاءاللہ تم جوان ہوئیں' پرائے گھر جانا ہے۔ اگر یہی عادت رہی تو وہاں کیوں کر گزارا ہوگا۔

گل بانو ماں کی یہ تقریر سن کر بگڑتی اور کہتیں: تم کو اِن باتوں کے سوا اور کچھ بھی کہنا آتا ہے۔ ہم سے نہ بولا کرو۔ تمہیں ہم دو بھر ہو گئے ہیں تو صاف صاف کہہ دو۔ دادا حضرت (بہادر شاہ) کے پاس جا رہیں گے

محبت کا مکتب

اِسی زمانہ کا ذکر ہے۔ میرزا دارا شکوہ شہزادہ خضر سلطان کا بیٹا گل بانو کے پاس آنے لگا۔ قلعہ میں باہمی پردہ کا دستور نہ تھا یعنی شاہی خاندان آپس میں پردہ نہ کرتے تھے۔ اِس واسطے

میرزا دادا کی آمد و رفت بے روک ٹوک ہوتی تھی۔

پہلے تو گل بانو اُن کی بہن اور وہ اُن کے بھائی تھے۔ چچا تایا کے دو بچے سمجھے جاتے تھے لیکن بعد میں عشق نے ایک اور رشتہ پیدا کیا۔ میرزا گل بانو کو کچھ اور سمجھتے تھے اور گل بانو داور کو ظاہری قرابت کے سوا کسی اور رشتہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔

ایک دن صبح کے وقت میرزا گل بانو کے پاس آئے تو دیکھا کہ بانو سیاہ دوشالہ اُوڑھے سنہری چھپر کھٹ میں سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی ہوتی ہیں۔ منہ کھلا ہوا ہے' اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہے' تکیہ الگ پڑا ہے' دونوں لونڈیاں مکھیاں اُڑا رہی ہیں۔

داور شکوہ چچی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا مگر کن انکھیوں سے گل بانو کا یہ عالم مخموری دیکھتا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا اور بولا: کیوں چچی (حضرت) بانو اتنے دن چڑھے تک سوتی رہتی ہے۔ دھوپ قریب آ گئی ہے۔ اب تو اِن کو جگا دینا چاہیے۔ چچی نے کہا: بیٹا! بانو کے مزاج کو جانتے ہو' کس کی شامت آئی ہے جو اُن کو جگائے' آفت برپا ہو جائے گی۔

داور نے کہا: دیکھیے میں جگاتا ہوں۔ دیکھوں کیا کرتی ہیں۔ چچی ہنس کر بولیں: جگا دو' تم سے کیا کہیں گی' تمہارا تو بہت لحاظ کرتی ہیں۔ داور نے جا کر تلوے میں گدگدیاں کیں۔ بانو نے انگڑائی لے کر پاؤں سمیٹ لیا اور بے اختیار آنکھیں کھول کر نگاہ طیش سے پائنتی کی طرف دیکھا۔ اِس کو خیال تھا کہ کسی لونڈی کی شرارت ہے' اِس کو گستاخی کی سزا دینی چاہیے مگر جب اُس نے ایسے شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے خود بخود اُس کا دل محبت کرتا تھا' تو شرم سے اُس نے دوشالہ کا آنچل منہ پر ڈال لیا اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ داور نے ہوش پاس منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار چیخ کر بولا: لو چچی حضرت! میں نے بانو کو اُٹھا بٹھایا۔

محبت نے بہت ترقی کی۔ مکتب عشق کی ابجد ختم ہو گئی اور درس ہجر و وصل کے شکوے پڑھے جانے لگے تو گل بانو کی ماں کو شبہ ہوا اور اُس نے داور شکوہ کا اپنے گھر میں آنا بند کر دیا۔

غدر کے نو مہینے بعد

درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک گوشہ میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اُوڑھے رات کے وقت ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کا مینہ دھواں دھار برس رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اِس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں عورت کا بستر تھا۔

یہ عورت سخت بیمار تھی۔ پسلی کے درد، بخار اور بے کسی میں اکیلی پڑی تڑپتی تھی۔ بخار کی بے ہوشی میں اُس نے آواز دی: اری او گل بدن، مردار مرگئی جلدی آ اور مجھ کو دوشالہ اُوڑھا دے۔ دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے، پردہ چھوڑ دے۔ روشنک تو ہی آ' گلبدن تو کہیں غارت ہوگئی۔ میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی لا۔ پسلی پر تیل مل۔ ارے درد سے میرا سانس رکا جاتا ہے۔

جب کوئی اِس آواز پر بھی اُس کے پاس نہ آیا تو اُس نے کمبل چہرے سے ہٹا دیا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر تنہا پڑی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مینہ سناٹے سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی (جو اُس کے باپ کی تھی)۔

یہ حالت دیکھ کر اُس عورت نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور کہا: بابا، بابا! میں تمہاری گل بانو ہوں، دیکھو اکیلی ہوں، اُٹھو مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔ آہ میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میرے پاس اِس بوسیدہ کمبل کے سوا اُوڑھنے کو کچھ نہیں ہے۔ میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میں محلوں سے جلاوطن ہوگئی۔ بابا! اپنی قبر میں مجھ کو بلا لو۔ اچھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ کفن سے منہ نکالو اور مجھ کو دیکھو۔ میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اِس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔

میرا چھپر کھٹ کیا ہوا۔ میرا دوشالہ کہاں گیا۔ میری سیج کہاں گئی۔ ابا ابا اُٹھو جی کب تک سوؤ گے۔ ہائے درد، اُفوہ سانس کیوں کر لوں۔ یہ کہتے کہتے اُس کو غفلت سی ہوگئی اور اُس نے دیکھا کہ میں مرگئی ہوں اور میرے والد میرزا دارا بخت مجھ کو قبر میں اُتار رہے ہیں اور رو رو کر کہتے ہیں:

یہ اِس بیچاری کا خاکی چھپر کھٹ ہے

آنکھ کھل گئی اور بیچاری بانو ایڑیاں رگڑنے لگی۔ سکرات کا وقت شروع ہوگیا اور وہ کہتی تھی لو صاحب میں مرتی ہوں۔ کون میرے حلق میں شربت ٹپکائے گا۔ کون مجھ کو یٰسین سنائے گا۔ کس کے زانو پر میرا سر رکھا جائے گا۔ الٰہی تیرے سوا میرا کوئی نہیں۔ تو ایک ہے۔ تیرا حبیب میرا مونس و رفیق ہے اور یہ چراغ اولیاء میرے پڑوسی:

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

شہزادی مرگئی اور دوسرے دن گورِ غریباں میں گڑ گئی اور وہی اُس کا ابدی چھپر کھٹ تھا جس میں وہ قیامت تک سوتی رہے گی۔

شہزادے کا بازار میں گھسٹنا

یہ دہلی جس کو ہندوستان کا دل اور حکومت کا تخت گاہ کہتے ہیں، جب آباد تھی اور لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع ٹمٹما رہی تھی، آفت اور بلا میں مبتلا ہونے کو ہوئی تو پہلے اِسکے باشندوں کے عمل میں فرق آیا: **الناس علی دین ملوکھم**، پہلے حاکموں کے اعمال خراب ہوئے، پھر رعیت بھی بداعمالیوں میں پڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجا پرجا دونوں برباد ہوگئے۔ مثالیں ہزاروں ہیں مگر ذیل میں ایک نہایت عبرت ناک کہانی سنا کر میں باشندگان ہند کو عموماً اور مسلمانوں اور صوفیوں کو خصوصاً خدا کے خوف سے ڈراتا ہوں۔

(1)

غدر سے پہلے ایک برس پہلے دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھرتے تھے اور بے پروائی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں، فاختاؤں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کیلئے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر خدا کی یاد میں تسبیح پڑھ رہی تھیں، غلے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آنکلا اور اُس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام کر کے عرض کیا کہ "میاں صاحبزادو! اِن بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے ہو۔ اُنہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ اِن کے بھی جان ہے، یہ بھی تمہاری طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں مگر بے بس ہیں اور منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے۔ تم بادشاہ کی اولاد ہو۔ بادشاہوں کو اپنے ملک کے رہنے والوں پر محبت اور مہربانی کرنی چاہیے۔ یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں۔ اِن کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے تو شانِ شاہی سے دُور نہیں"۔ بڑے شہزادے نے شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھ دی مگر چھوٹے مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے: "جارے جادو نکلے کا آدمی، ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے، تو کون ہوتا ہے ہم کو سمجھانے والا۔ سیر و شکار سب کرتے ہیں، ہم نے کیا تو کونسا گناہ ہوگیا"۔ فقیر بولا: "صاحب عالم ناراض نہ ہوں۔ شکار ایسے جانوروں کا کرنا چاہیے، ایک جان جائے تو دس پانچ جانوں کا پیٹ تو بھرے، اِن ننھی ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ۔ بیس ماروں گے تب بھی ایک آدمی شکم سیر نہ ہوگا"۔ نصیر الملک فقیر

کے دوبارہ بولنے پر آگ بگولا ہوگئے اور ایک غلہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اِس زور سے مارا کہ بیچارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا: ''ہائے ٹانگ توڑ ڈالی'' فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے قبرستان کی طرف چلنے لگا۔ گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا: ''وہ تخت کیوں کر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑ دی' خدا تیری بھی ٹانگیں توڑ دے اور تجھ کو بھی اِسی طرح گھسٹنا نصیب ہو''

(2)

توپیں گرج رہی تھیں' گولے برس رہے تھے' زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ شہر دلی ویران اور سنسان ہوتا جاتا تھا کہ لال قلعہ سے پھر وہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف بیس پچیس گورے سپاہی دھاوا کرتے چلے آتے تھے۔ اُنہوں نے نوعمر سواروں پر یک لخت بندوقوں کی باڑ ماری۔ گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور یہ سب شہزادے فرشِ خاک پر گر کر خون میں تڑپنے لگے۔ گورے جب قریب آئے تو دیکھا کہ دو شہزادے جان بحق ہو چکے ہیں مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا تو معلوم ہوا کہ اُس کے کہیں زخم نہیں آیا۔ گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھرنچیں آ گئی ہیں اور دہشت کے مارے غشی طاری ہو گئی ہے۔ صحیح سالم دیکھ کر گھوڑے کی باگ دوڑ سے شہزادے کے ہاتھ باندھے گئے اور حراست میں لے کر دو سپاہیوں کے ہاتھ کیمپ میں بھجوا دیا گیا۔ کیمپ پہاڑی پر تھا جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی۔ جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیرالملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم ہوا کہ اِس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

(3)

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھس گیا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہو گئے۔ تیموری بزم کا چراغ جھلملا کر گل ہو گیا اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے آباد ہونے لگے۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر چیخیں مارنے

لگیں۔

اِسی دار و گیر میں پہاڑی کیمپ میں مرزا نصیرالملک رسی سے بندھے بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہا: ''جایئے' میں نے آپ کی رہائی کیلئے صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہے۔ جلدی بھاگ جاؤ' ایسا نہ ہو کہ کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ''

مرزا بیچارے پیدل چلنا کیا جانیں' حیران تھے کہ کیا کریں۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا' پٹھان سپاہی کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف ہو لئے۔ چل رہے تھے مگر خبر نہ تھی کہ کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہوں گے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے' زبان خشک ہو گئی' حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ تھک کر ایک درخت کے سائے میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا۔ ہم کہاں جائیں' کدھر ہمارا ٹھکانہ ہے۔ اُوپر نگاہ اُٹھائی تو درخت پر نظر گئی' دیکھا کہ ایک فاختہ کا گھونسلہ بنا ہوا ہے اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہے۔ اُس کی آزادی اور آسائش پر شہزادہ کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے: ''فاختہ! مجھ سے تو تُو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے۔ میرے لیے تو آج زمین و آسمان میں کہیں جگہ نہیں ہے۔

تھوڑی دُور ایک بستی نظر آئی' ہمت کر کے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے مگر لشتم پشتم گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو عجیب سماں نظر آیا۔

ایک درخت کے نیچے سینکڑوں گنوار جمع تھے اور چبوترہ پر ایک تیرہ سال کی معصوم لڑکی بیٹھی تھی جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں' کان لہولہان ہو رہے تھے اور دہقانی اِس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ جونہی مرزا کی نگاہ اُس بچی پر پڑی اور اُس بیچاری نے مرزا کو دیکھا' دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔

بھائی بہن اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ مرزا نصیرالملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر قلعہ قطب صاحب کو چلی گئی تھی۔ مرزا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اِس آفت میں مبتلا ہو گئی ہو گی۔ پوچھا ملکہ تم یہاں کہاں؟ رو کر بولی:

''آغا جی گوجروں نے ہم کو لوٹ لیا' نوکروں کو مار ڈالا' اماں جان کو دوسرے گاؤں لے گئے اور مجھ کو یہاں لے آئے۔ میری بالیاں اُنہوں نے نوچ لیں' میرے طمانچے ہی طمانچے مارے ہیں......

اتنا کہہ کر لڑکی کی ہچکی بندھ گئی اور پھر کوئی لفظ اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ بیکس شہزادے نے اپنی غریب بہن کو دلاسا دیا اور اِن گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اِس کو چھوڑ دو۔ گوجر بگڑ کر بولے "ارے جا آیا بچارا' ایک گنڈاسا ایسا ماریں گے کہ گردن کٹ جائے گی۔ اِس کو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں۔ لا دام دے جا اور لے جا"

مرزا نے کہا: "چودھریو! دام کہاں سے دوں۔ میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے قابل ہوں' دیکھو ذرا رحم کرو۔ کل تم رعیت تھے اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے' آج آنکھیں نہ پھیرو' خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے' اگر ہمارے دن پھر گئے تو مالا مال کر دیں گے" یہ سُن کر گنوار بہت ہنسے اور کہنے لگے: "اوہو! آپ بادشاہ سلامت ہیں۔ تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھوں بیچیں گے اور یہ چھوکری تو اب ہمارے گاؤں کی ٹہل کرے گی' جھاڑو دے گی' ڈھوروں کے آگے چارہ ڈالے گی' گوبر اُٹھائے گی"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے انگریزی فوج آ گئی اور گاؤں والوں کو گھیر لیا اور چار چودھریوں کو اور اِن دونوں شہزادے شہزادی کو پکڑ کر لے گئے۔

(4)

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں اور جس کو انگریزی افسر کہہ دیتے تھے کہ قابل دار ہے' اُسی کو پھانسی مل جاتی تھی۔ ہر روز سینکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جاتے' گولیوں سے اُڑائے جاتے اور تلوار سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اِس خون ریزی سے تہلکہ تھا۔ مرزا نصیر الملک اور اُن کی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے اور صاحب نے اِن دونوں کو خورد سال سمجھ کر بے قصور سمجھا اور چھوڑ دیا۔ دونوں نجات پا کر ایک سوداگر کے ہاں ملازم ہو گئے۔ لڑکی سوداگر کے بچے کو کھلاتی اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف لایا کرتے تھے۔ چند روز بعد لڑکی تو ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئی اور مرزا کچھ دن اِدھر نوکریاں چاکریاں کرتے رہے۔ آخر کار سرکار نے اُن کی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

ایک برس کا ذکر ہے' دہلی کے بازار چتلی قبر' کمرہ بنگش وغیرہ میں ایک پیر مرد جن کا چہرہ چنگیزی نسل کا پتہ دیتا تھا' کولہوں کے بل گھسٹتے پھرا کرتے تھے' اُن کے پاؤں شاید فالج سے بیکار ہو گئے تھے' اِس لئے ہاتھوں کو ٹیک کر کولہوں کو گھسیٹتے ہوئے راستہ چلتے تھے۔ اُن کے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حسرت سے دیکھتے۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی

محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے۔ جن لوگوں کو اِن کا حال معلوم تھا' ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈال دیتے تھے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اِن کا نام مرزا نصیر الملک ہے اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن قرضہ میں برباد کر دی اور اب خاموش گداگری پر گزارہ ہے۔ مجھ کو اُن کے حال سے عبرت ہوتی تھی اور جب اُن کا ابتدائی قصہ' جو کچھ خود اُن کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سنا تھا' یاد آتا تو دل ہل جاتا تھا کہ اِس فقیر کا کہنا پورا ہو جس کی ٹانگ میں اُنہوں نے غلہ مارا تھا۔ شہزادہ صاحب کا بازار میں گھسٹتا پھرنا سخت سے سخت دل کو موم کر دیتا تھا اور خدا کے خوف سے دل کانپ جاتا تھا۔ اب اِن شہزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

شہزادی کی بپتا

ہونے کو غدر پچاس برس کی کہانی ہے مگر مجھ سے پوچھو تو کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اُن دنوں میری عمر سولہ ستر برس کی تھی۔ میں اپنے بھائی سے دو برس چھوٹی اور مرنے والی بہن ناز بانو سے چھ سال بڑی ہوں۔ میرا نام سلطان بانو ہے۔ ابا جان مرزا قویش بہادر ظلِ سبحانی حضرت بہادر شاہ کے فرزند تھے۔ بھائی یاور شاہ اور ہم بہنوں میں بڑی محبت تھی۔ بس ایک دوسرے پر فدا تھے۔ آ کا بھائی کیلئے باہر کئی استاد طرح طرح کی باتیں سکھانے والے تھے، کوئی حافظ تھا اور کوئی مولوی، کوئی خوش نویس تھا اور کوئی تیرانداز۔

اور ہم محل میں سینا پرونا اور کشیدہ کاڑھنا مغلانیوں سے سیکھتے تھے۔ دستور تھا کہ حضرت ظلِ سبحانی جن بچوں اور بڑوں پر نظرِ عنایت رکھتے تھے، اُن کو صبح کا کھانا شاہی دسترخوان پر حضور والا کے ہمراہ کھلایا جاتا تھا۔ چنانچہ ظلِ سبحانی مجھ کو بھی بہت چاہتے تھے اور میں ہمیشہ صبح کے وقت کھانے کے واسطے بلائی جاتی تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور چچا ابوبکر کے لڑکے مرزا سہراب سے میری نسبت ٹھہر گئی تو حضور کے دسترخوان پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی کیونکہ وہاں مرزا سہراب بھی کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے کل خاندان میں باہم پردہ نہ تھا اور نہ اب ہے، شرعی نامحرم گھر میں آتے جاتے تھے، مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھی۔ میں ایک آن کیلئے کسی غیر مرد کے سامنے جانا گوارہ نہیں کرتی تھی۔ پر کیا کرتی حضور کے حکم کے خلاف دسترخوان پر کس طرح نہ جاتی۔ لیکن غنیمت یہ تھا کہ آدابِ سلطانی کے باعث سب نظریں جھکائے رکھتے تھے، مجال نہ تھی کہ ایک بچہ بھی اِدھر اُدھر دیکھے یا اُونچی آواز سے بولے۔

قاعدہ یہ تھا کہ جب حضور معلّٰی کوئی خاص کھانا کسی کو مرحمت فرماتے تو وہ بچہ ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد، اپنی جگہ سے اُٹھ کر جائے ادب پر جاتا اور جھک کر تین سلام بجالاتا۔ ایک

دن میرے ساتھ بھی یہ اتفاق پیش آیا کہ حضور نے ایک نئی قسم کا ایرانی کھانا مجھ کو عطا کیا اور فرمایا: ''سلطانہ! تو تو کچھ کھاتی ہی نہیں، ادب اور لحاظ ایک حد تک اچھا ہوتا ہے نہ کہ اتنا کہ دسترخوان پر سے بھوکا اُٹھا جائے۔ میں کھڑی ہوئی اور جائے ادب پر جا کر تین آداب بجالائی، مگر نہ پوچھو اِس مشکل سے آئی گئی کہ دل ہی جانتا ہے۔ ہر قدم پر اُلجھتی تھی اور اوسان خطا ہوئے جاتے تھے۔

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ زمانہ کیا ہوا۔ وہ خوشی کے دن کہاں چلے گئے۔ جب ہم اپنے محلوں میں آزاد اور بے فکر پھرا کرتے تھے۔ ظلِ سبحانی کا سایہ سر پر تھا اور لوگ ہمیں ملکہ عالم کہہ کر پکارتے تھے۔ دنیا کے اُتار چڑھاؤ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب حضور معلّٰی مقبرہ ہمایوں میں گرفتار کئے گئے تو مرزا سہراب تلوار گھسیٹ کر دوڑے مگر دوسرے گورے نے اُن کو گولی ماردی اور وہ ایک آہ کر کے گرے اور تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے اور میں بت بنی تماشا دیکھتی رہی۔ اتنے میں خواجہ سرا آیا اور کہنے لگا: بیگم! کیوں کھڑی ہو، چلو تمہارے ابا جان نے بلایا ہے'' میں اِسی بے خودی کے عالم میں اُس کے ساتھ ہولی۔ دریائی دروازے سے اُتر کر دیکھا کہ ابا جان مرزا قویش بہادر گھوڑے پر سوار ننگے سر کھڑے تھے۔ تمام چہرہ اور سر کے بال خاک آلودہ ہو رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آنسو بھر لائے اور فرمایا: ''لو سلطانہ! ہمارا بھی کوچ ہے۔ جوان بیٹا جس کے سہرے کی آرزو تھی، آنکھوں کے سامنے ایک سکھ کی سنگین کا نشانہ بن گیا۔ یہ سنتے ہی میں نے ایک چیخ ماری اور ہائے بھائی کہہ کر رونے لگی۔ وہ گھوڑے سے اُتر آئے۔ مجھ کو اور ناز بانو کو گلے لگا کر پیار اور تسلی دینے لگے اور کہنے لگے: بیٹی اب لوگ میری تلاش میں ہیں۔ میں بھی دو چار گھڑی کا مہمان ہوں۔ تم ماشاء اللہ جوان اور سمجھ دار ہو، اپنی چھوٹی بہن کو دلاسا دو اور آنے والی مصیبتوں پر صبر کرو۔ خبر نہیں کہ اس کے بعد کیا پیش آنے والا ہے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ تم کو تنہا چھوڑ کر کہیں جاؤں، پر ایک نہ ایک دن تمہیں بن باپ کا بننا ہی پڑے گا۔ ناز بانو تو ابھی بچہ ہے۔ اُس کی دلداری کرنا اور نیکی سے زندگی بسر کرنا اور دیکھو ناز بانو! اب تم شہزادی نہیں۔ کسی چیز کیلئے ضد نہ کرنا جو میسر آئے اُسے شکر کر کے کھا لینا اور اگر کوئی شخص کچھ کھاتا ہو تو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا ورنہ لوگ کہیں گے کہ شہزادیاں بڑی بدنیت ہوتی ہیں۔ پھر ہم دونوں کو خواجہ سرا کے سپرد کر کے کہا۔ اِن کو جہاں ہمارے خاندان کے اور آدمی ہوں، پہنچا دینا۔ اِس کے بعد ہم کو پیار کیا اور روتے ہوئے گھوڑا دوڑاتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔ پھر پتہ نہ لگا کہ وہ کیا ہوئے۔ خواجہ سرا ہم کو لے چلا۔ یہ ہمارے گھر کا قدیمی نمک خوار تھا۔ تھوڑی دور تک ناز بانو ج

نازوں کی پلی تھی' چلی مگر پھر پاؤں کی طاقت نے جواب دے دیا اور دو قدم چلنا دوبھر ہو گیا۔ مجھ کو کبھی پیدل چلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی تھی مگر بانو کو لئے چلی جاتی تھی۔ اتنے میں ناز بانو کے ایک نوک دار کانٹا چبھ گیا اور وہ ہائے کہہ کر گر پڑی۔ میں نے جلدی سے اُسے اُٹھایا اور کانٹا نکالنے لگی مگر خواجہ سرا کھڑا دیکھتا گیا اور یہ نہ ہوا کہ میرا ہاتھ بٹا لیتا بلکہ چلنے کی جلدی کرنے لگا۔ بہن بولی: آپا جان! مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا' ناظر کو گھر بھیج کر گھر سے پالکی منگوا لو۔ گھر او رپالکی کا نام سن کر میرا جی بھر آیا اور اُس کو تسلی دینے لگی۔ خواجہ سرا نے پھر کہا کہ چلو بس ہو چکا جلدی چلو۔ ناز بانو کا مزاج تیز تھا۔ وہ نوکروں کو ہمیشہ سخت سست کہہ لیا کرتی تھی اور یہ لوگ دم بخود ہو کر سن لیتے تھے۔ اِسی خیال سے اُس نے خواجہ سرا کو پھر دو ایک باتیں سنا دیں۔ کم بخت کو سنتے ہی غصہ اتنا آیا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور بڑی بے ترسی سے بن باپ کی دکھیا بچی کے ایک طمانچہ مارا۔ ناز بانو بلبلا اُٹھی۔ وہ کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ پٹی تھی یا ایسا طمانچہ لگا۔

اُس کے رونے سے مجھ کو بے اختیار رونا آ گیا۔ ہم تو روتے رہے اور خواجہ سرا کہیں چلا گیا۔ پھر خبر نہ ملی کہ وہ کیا ہوا۔ ہم دونوں بمشکل تمام گرتے پڑتے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں پہنچے۔ یہاں دہلی کے اور خاص ہمارے خاندان کے سینکڑوں آدمی تھے مگر ہر ایک اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار۔ قیامت کا نمونہ تھا۔ کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ اِسی اثناء میں وبا پھیلی اور پیاری بہن ناز بانو اِس میں رخصت ہو گئیں' میں اکیلی رہ گئی۔ امن ہوا جب بھی مجھ دکھیا کو سکھ نہ ملا۔ آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انگریزی سرکار نے ہم لوگوں کی پرورش کرنا چاہی اور میرا پانچ روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر ہوا جو اب بھی ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بھکاری شہزادہ

دہلی کی جامع مسجد سے جو راستہ خیا محل اور چتلی قبر ہوتا ہوا دہلی دروازے کی طرف گیا ہے وہاں ایک محلّہ کلو خواص کی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔ اِس محلّہ سے روزانہ رات کا اندھیرا ہو جانے کے بعد ایک فقیر باہر آتا ہے اور جامع مسجد تک جاتا ہے۔ پھر وہاں سے واپس چلا آتا ہے۔ اِس فقیر کا قد بہت لمبا ہے' جسم دبلا ہے' داڑھی چگی ہے اور سفید ہے۔ گال پچکے ہوئے ہیں۔ آنکھوں سے معذور ہے۔ میلا پیوند لگا ہوا ایک پاجامہ ہے۔ ٹوٹی ہوئی جوتیاں جن کو تیڑے کہنا چاہیے' پیروں میں ہیں۔ کرتہ بہت میلا ہے اور اِس میں بھی دس بارہ پیوند ہیں۔ سر پر پٹھے ہیں لیکن بال اُلجھے ہوئے ہیں۔ پھٹی ہوئی ایک ٹوپی تالو پر رکھی ہے۔ فقیر کے ہاتھ میں ایک بانس کی اُونچی سی لکڑی ہے اور ایک ہاتھ میں مٹی کا پیالہ ہے جس کا ایک کنارہ ٹوٹا ہوا ہے۔ فقیر کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو چنڈو پیتا ہے اور یا کئی مہینے کی بیماری کے بعد آج ہی اُٹھا ہے کیونکہ چہرہ پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ جب چلتا ہے تو داہنے پاؤں کو گھسیٹ کر قدم اُٹھتا ہے۔ شاید اُسے کبھی فالج ہو گیا ہو گا۔

اُس کی آواز بہت بلند اور بہت دردناک ہے۔ جب وہ نہایت مایوس اور حسرت آمیز لہجہ میں بلند آواز سے کہتا ہے: "یا اللہ! ایک پیسہ کا آٹا دلوا دے' تو ہی دے گا' تو ہی دلوائے گا۔ ایک پیسہ کا آٹا دلوا دے" تو بازار والے اور بازار کے قریب جتنے گھر ہیں' اُن کے رہنے والے اِس آواز سے خود بخود متاثر ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اِن میں سوائے دو چار کے کوئی بھی واقف نہیں ہے کہ یہ فقیر کون ہے اور اِس کی آواز میں اتنا درد کیوں ہے۔ بعض گھروں کی عورتیں یہ کہنے لگتی ہیں کہ شام ہوئی اور یہ منحوس آواز کانوں میں آئی۔ ہمارا تو کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے جب یہ آواز سنتے ہیں۔ خبر نہیں کون فقیر ہے جو ہمیشہ رات کے وقت بھیک مانگنے نکلتا ہے' دن کو کبھی اِس کی آواز نہیں آتی۔

فقیر جب کلو خواص کی حویلی سے بازار میں آتا ہے تو سیدھا جامع مسجد کی طرف سے لکڑی ٹیکتا ہوا اپنے داہنے مفلوج پاؤں کو کھینچتا ہوا ٹوٹے ہوئے تیڑوں سے خاک اُڑاتا ہوا آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ایک ایک منٹ کے وقفے کے بعد اُس کی زبان سے بس یہ صدا نکلتی بلند ہوتی ہے:

''یا اللہ! ایک پیسہ کا آٹا دلوادے' تو ہی دے گا' تو ہی دلوائے گا' ایک پیسہ کا آٹا دلوادے''

فقیر کسی دکان یا کسی شخص کے سامنے نہیں ٹھہرتا' سیدھا چلتا رہتا ہے۔اگر کسی راہ گیر کو یا کسی دوکان دار کو رحم آگیا اور اُس نے فقیر کے پیالہ میں پیسہ ڈال دیا یا آٹا اور کچھ کھانے کی چیز ڈال دی تو فقیر نے بس اتنا کہا: ''بھلا ہو بابا' خدا تم کو برا وقت نہ دکھائے'' اور آگے بڑھ گیا۔آنکھوں کی معذوری کی وجہ سے دیکھ ہی نہیں سکتا کہ اِس کو خیرات دینے والا کون تھا اور کون ہے۔

جامع مسجد سے واپسی کے وقت بھی یہی آواز لگاتا ہوا کلو خواص کی حویلی میں آجاتا ہے۔اِس حویلی میں غریب مسلمانوں کے بہت سے الگ الگ چھوٹے چھوٹے مکان ہیں۔انہی مکانوں میں ایک بہت ہی چھوٹا اور ٹوٹا پھوٹا مکان اس فقیر کا بھی ہے۔گھر کے دروازہ پر واپس آتا ہے تو کواڑوں کی لگی ہوئی کنڈی کھول کر اندر جاتا ہے۔اِس مکان میں صرف ایک دلان ہے اور ایک کوٹھری ہے اور ایک پاخانہ ہے اور ایک چھوٹا سا صحن ہے۔دلان میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی ہے اور فرش پر پھٹا ہوا کمبل بچھا ہوا ہے۔

دہلی والوں کو معلوم نہیں کہ یہ فقیر کون ہے۔بس دو چار جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ بہادر شاہ ظفر کا حقیقی نواسہ ہے اور اِس کا نام میرزا قمر سلطان ہے۔غدر سے پہلے خوب جوان تھا اور قلعہ میں اِس کے حسن کی اور قد رعنا کی بڑی دھوم تھی۔گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتا تھا تو قلعہ کی عورتیں اور دہلی کے بازار والے راستہ چلتے چلتے کھڑے ہو جاتے تھے اور اِس کی خوبصورتی دیکھتے تھے اور سب لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔

آج یہ وقت ہے کہ غدر 1857ء کے انقلاب نے اور مسلمانوں کی سلطنت اور تہذیب کی بربادی نے اِس کو بھکاری بنا دیا۔گورنمنٹ نے پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کی تھی۔وہ بھی فضول خرچی کی وجہ سے بنئے کے ہاں رہن ہوگئی۔اب رات کو گداگری کیلئے نکلتا ہے اور جو کچھ مل جاتا ہے' اِس سے دونوں وقت کی گذر اوقات کر لیتا ہے۔

کسی نے پوچھا: ''مرزا تم دن کو باہر کیوں نہیں نکلتے؟'' شہزادہ قمر نے جواب دیا: ''جن بازاروں میں میری اچھی صورت اور شاندار سواری کی دھوم مچا کرتی تھی' اِن بازاروں میں یہ بری

صورت اور یہ بری حالت لے کر دن کے وقت نکلتے ہوئے شرم آتی ہے۔اِس لئے رات کو نکلتا ہوں اور صرف خدا سے مانگتا ہوں اور اسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں اور وہی مجھے دیتا ہے۔

پھر کسی نے کہا: ''مرزا! کیا افیون کی عادت بھی ہے؟'' تو شہزادہ قمر سلطان جواب دیتا ہے کہ جی ہاں بری صحبت کے سبب افیون کی عادت بھی پڑ گئی اور کبھی کبھی چنڈو بھی پی لیتا ہوں۔

پھر پوچھا کہ غدر سے لے کر آج تک کیا کیا گذری' ذرا اِس کا حال تو سناؤ تو قمر سلطان ایک ٹھنڈا سانس لے کر چپ ہو جاتا ہے اور کچھ دیر کے بعد کہتا ہے: کچھ نہ پوچھو' خواب دیکھ رہا تھا' آنکھ کھل گئی' اب جاگ رہا ہوں اور وہ خواب پھر کبھی نظر نہیں آیا۔نہ اِس کے نظر آنے کی اُمید ہے۔

☆☆☆☆☆

یتیم شہزادہ کی عید

1232ء کی عید الفطر کا ذکر ہے‘ دلی میں 29 کا چاند نظر نہ آیا۔ درزی خوش تھے کہ اُن کو ایک دن کام کرنے کو مل گیا۔ جوتے والوں کو بھی خوشی تھی کہ ایک روز کی بکری بڑھ گئی مگر مسلمانوں کے ایک غریب محلّہ میں تیموریہ خاندان کا ایک گھرانہ اُس دن بہت غمگین تھا۔ یہ لوگ عصر سے پہلے اپنے گھر کے وارث میرزا دلدار شاہ کو دفن کر کے آئے تھے۔

دلدار شاہ دس دن سے بیمار تھے۔ اُن کو پانچ روپے ماہوار پنشن ملتی تھی۔ گھر میں اُن کی بیوی اور یہ خود کناری بنتے تھے جس میں اُن کو اتنی معقول آمدنی تھی کہ خوب آرام سے بسر اوقات کرتے تھے۔ اُن کے چار بچے تھے۔ تین لڑکیاں اور لڑکا۔ دو لڑکیوں کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ ایک ڈیڑھ سال کی گود میں تھا اور ایک لڑکا دس برس کا تھا۔ دلدار شاہ اِس لڑکے کو بہت چاہتے تھے۔ بیگم نے چاہا کہ لڑکا مکتب میں جائے مگر دلدار شاہ کو بچہ اِس قدر لاڈلا تھا کہ اُنہوں نے ایک دن بھی مکتب نہ بھیجا۔

لڑکا سارا دن گلیوں میں آوارہ پھرتا تھا۔ زبان پر گالیاں اِس قدر چڑھ گئی تھیں کہ بات بات میں مغلظات بکتا تھا اور باوا جان اُس کی بھولی بھولی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ میرزا دلدار شاہ بہادر شاہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ مرتے وقت اُن کی عمر 65 برس کی ہوگی کیونکہ جب یہ لڑکا پیدا ہوا تو اُن کی عمر 55 برس تھی۔ بڑھاپے کی اولاد سب کو پیاری ہوتی ہے خاص کر بیٹا۔ میرزا دلدار شاہ جتنی محبت کرتے تھوڑی تھی۔

ایک دن اُن کے ایک دوست نے کہا: صاحب عالم! بچہ کے لکھنے پڑھنے کے یہی عمر ہے۔ اب نہ پڑھے گا تو کب پڑھے گا۔ لاڈ پیار بھی ایک حد تک اچھا ہوتا ہے۔ آپ اِس کے حق میں کانٹے بوتے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے‘ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایک دن سب کو مرنا

ہے۔ خدانخواستہ آپ کی آنکھیں بند ہوگئیں تو اِس معصوم کا کہیں ٹھکانہ نہ رہے گا‘ لکھ پڑھ لے گا تو دو روٹیاں کما کھائے گا۔ اِس زمانہ میں شریفوں کی گزران بہت دشوار ہوگئی ہے‘ کچھ آئندہ کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اِس کو غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے اور بزرگوں کی ناک کٹے۔

میرزا دلدار شاہ اِس ہمدردی سے بگڑ گئے اور بولے: آپ میرے مرنے کی بدشگونی کرتے ہیں۔ ابھی میری کونسی ایسی عمر ہے۔ لوگ تو سو برس تک زندہ رہتے ہیں۔ رہا بچہ کا پڑھانا سو میرے نزدیک اِس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے بی۔ اے پاس مارے مارے پھرتے ہیں اور دو کوڑی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میرا بچہ پہلے ہی دھان پان ہے‘ آئے دن کا مریض ہے۔ میرا دل گوارہ نہیں کرتا کہ ظالم استادوں کے حوالے کر کے اُس کی نازک ہڈیوں کو قمچیوں کا نشانہ بناؤں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے عیش کراؤں گا۔ میں نہ رہوں گا تو خدا رازق ہے وہ چیونٹی تک کو کھانا دیتا ہے۔ پتھر کے کیڑے کو رزق پہنچاتا ہے۔ آدمی کے بچہ کو کہیں بھوکا مارے گا۔ میاں ہم نے زمانہ کا بڑا گرم و سرد رنگ دیکھا ہے‘ ہمارے ماں باپ نے بھی ہم کو نہ پڑھایا تو کیا ہم بھوکے مرتے ہیں۔

نصیحت کرنے والے بیچارے یہ جواب سن کر چپ ہوگئے اور دل ہی دل میں پچھتائے کہ ناحق اُن سے دردمندی کی بات کہی۔ لیکن اُنہیں خیال آیا کہ حق بات کہنے سے چپکا رہنا گناہ ہے: ”الساکت عن الحق شیطان اخرس“ سچی بات کہنے سے خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔ اِس لئے اُنہوں نے پھر کہا کہ جانب آپ ناراض نہ ہوں‘ میں خدانخواستہ آپ کا مرنا نہیں چاہتا۔ میں نے تو دُور اندیشی کی بات کہی تھی‘ آپ کو ناگوار گزری تو معاف فرمایئے مگر یہ تو خیال فرما لیجیے کہ آپ کے بچپن میں اور حالت تھی اور آجکل اور زمانہ ہے۔ اُس وقت قلعہ آباد تھا۔ جہاں پناہ ظلِ سبحانی بہادر شاہ حضرت کا سایہ سر پر تھا۔ ہر بات سے بے فکری تھی لیکن آج تو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ بادشاہی ہے نہ امیری ہے۔ ہر مسلمان کے گھر میں گدائی اور فقیری ہے۔ اب تو جو ہنر سیکھے گا اور اپنی روٹی اپنے بازو سے کمائے گا‘ وہی لالوں کا لال بنے گا ورنہ ذلت و خواری کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

دلدار شاہ نے کہا: ہاں یہ سچ ہے۔ میں اِس کو سمجھتا ہوں مگر آخری ہماری بھی تو اتنی عمر اِسی بربادی کے زمانہ میں بسر ہوئی۔ سرکار نے پانچ روپیہ کی جو پنشن مقرر کی ہے تم جانتے ہو کہ اس میں ہمارے کتنے وقت نکلتے ہیں۔ آٹھ آنے روز تو بچہ کا خرچ ہے‘ ہم دونوں میاں بیوی روپیہ ڈیڑھ

روپیہ روز کی کناری بنتے ہیں اور مزے سے گزر اوقات کرتے ہیں۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک تیسرے صاحب تشریف لائے اور اُنہوں نے کہا کہ آسٹریلیا کے بادشاہ کا ولی عہد مارا گیا۔ جب بادشاہ کو اِس کی خبر پہنچی تو بے قرار ہو گیا اور ہائے کا نعرہ مار کر کہا ظالموں نے سب کچھ لوٹ لیا اور میرے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا۔

میرزا دلدار شاہ یہ سن کر ہنسنے لگے اور بولے: بھئی واہ اچھی بہادری ہے۔ بیٹے کے ناگہانی مرنے سے ایسے گھبرا گئے۔ میاں جب بہادر شاہ حضرت کے صاحبزادے میرزا مغل وغیرہ گولی سے مارے گئے اور اُن کے سر کاٹ کر سامنے لائے گئے تو بادشاہ نے اخوان میں کٹے ہوئے سر دیکھ کر نہایت لاپروائی سے فرمایا: الحمدللہ! سرخرو ہو کر سامنے آئے۔ مرد لوگ اِسی دن کیلئے بچے پالتے ہیں۔

جو صاحب خبر لائے تھے وہ بولے: کیوں جناب غدر میں آپ کی عمر کیا ہوگی۔ میرزا دلدار شاہ نے کہا: کوئی چودہ پندرہ برس کی مجھے سب واقعات اچھی طرح یاد ہیں۔ باوا جان ہم کو لے کر غازی آباد جارہے تھے کہ ہنڈن ندی پر ہم کو فوج نے پکڑ لیا اور والدہ اور میری چھوٹی بہن چیخیں مار کر رونے لگیں۔ والد نے اُن کو منع کیا اور آنکھ بچا کر ایک سپاہی کی تلوار اُٹھالی۔ تلوار ہاتھ میں لیتی تھی کہ سپاہی چاروں طرف سے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ اُنہوں نے دو چار کو زخمی کیا مگر سنگینوں اور تلواروں کے اتنے وار اُن پر ہوئے کہ بیچارے قیمہ قیمہ ہو کر گر پڑے اور شہید ہو گئے۔

اُن کی شہادت کے بعد سپاہیوں نے میری بہن اور ماں کے کانوں کو نوچ لیا اور جو کچھ اُن کے پاس تھا' چھین کر چلتے ہوئے۔ مجھ کو اُنہوں نے قید کر کے ساتھ لے لیا۔ جس وقت میں والدہ سے جدا ہوا ہوں اُن کی آہ و زاری سے آسمان ہلا جاتا تھا۔ وہ کلیجہ کو تھامے ہوئے چیختی تھیں اور کہتی تھیں:

"ارے میرے لال کو چھوڑ دو۔ تم نے میرے سرتاج کو خاک میں سلا دیا۔ اِس یتیم پر رحم کرو۔ میں رنڈیا کس کے سہارا رنڈاپا کاٹوں گی۔ اللہ میرا کلیجہ پھٹا جارہا ہے۔ میرا دلدار کہاں جاتا ہے۔ کوئی اکبر و شاہجہان کو قبر سے بلائے' اُن کے گھرانے کی دُکھیا کی بپتا سنائے۔ دیکھو میرے دل کے ٹکڑے کو مٹھی میں مسلے دیتے ہیں۔ ارے کوئی آؤ میری گودیوں کا پالا مجھ کو دلواؤ"

چھوٹی بہن آ کا بھائی کہتی ہوئی میری طرف دوڑی مگر سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیئے اور مجھ کو باگ ڈور سے باندھ لیا۔ گھوڑے دوڑتے تھے تو میں بھی دوڑتا تھا۔ پاؤں لہو لہان

ہو گئے۔ دل دھڑکتا تھا' دم اُکھڑا جاتا تھا۔

پوچھا: میرزا یہ بات رہ گئی کہ تمہاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہوا؟"

میرزا نے کہا: آج تک اُن کا پتہ نہیں لگا۔ خبر نہیں کہ اُن پر کیا گزری اور وہ کہاں گئیں۔ مجھ کو سپاہی اپنے ہمراہ دلی لائے اور یہاں سے اندور لے گئے۔ مجھ سے گھوڑے ملواتے تھے اور گھوڑوں کی لید صاف کراتے تھے۔

چند روز بعد مجھ کو چھوڑ دیا گیا اور میں نے اندور میں ایک ٹھاکر کے ہاں دربانی کی نوکری کر لی۔ کئی برس اس نے گزارے پھر دلی میں آیا اور پنشن کی درخواست دی۔ اِس کی مہربانی سے میری اوروں کی طرح پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر ہو گئی۔ اِس کے بعد میں نے شادی کی' یہ بچے پیدا ہوئے۔

اِس واقعہ کے بعد میرزا دلدار شاہ بیمار ہوئے اور دس دن بیمار رہ کر آخرت کو سدھارے۔ اُن کے مرنے کا غم سب سے زیادہ اُن کی بیوی اور لڑکے کو تھا۔ لڑکا دس برس کا تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ابا جان مر گئے ہیں مگر وہ بار بار اماں سے کہتا تھا کہ ابا جان کو بلا دو۔

الغرض رونے دھونے میں یہ سب لوگ سو گئے۔ سحری کو بیگم صاحبہ بیدار ہوئیں تو دیکھا کہ گھر میں جھاڑو پھری ہوئی ہے۔ کپڑا لتا برتن بھانڈا سب چور لے گئے۔ بیچاری بیوی نے سر پیٹ لیا۔ اب میں کیا کروں گی۔ میرے پاس تو ایک تنکا بھی نہ رہا۔ گھر کے مالک کے اُٹھتے ہی چوری بھی ہوئی۔

آس پاس کے محلہ دار اُن کے رونے کی آوازیں سُن کر جمع ہو گئے اور سب نے بہت افسوس کیا۔ پڑوس میں ایک گوٹے والے رہتے تھے۔ اُنہوں نے سحری کیلئے دودھ اور نان پاؤ بھیجا اور بیچاری نے ٹھنڈا سانس بھر کر اُس کو لے لیا۔

یہ پہلا دن تھا کہ بیوہ شہزادی نے خیرات کی سحری کھائی جس کا اُس کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا تھا۔ دن ہوا تو چاروں طرف عید کے سامان نظر آتے تھے۔ چاندرات کی چہل پہل ہر گھر میں تھی مگر نہ تھی تو اِس گھر میں جہاں دودھ پیتی بچی کو گود میں لئے بیوی شہزادی یتیم شہزادے کو سمجھا رہی تھی کیونکہ وہ نئی جوتی اور نئے کپڑے مانگتا تھا۔ ماں نے کہا:

" بیٹا تمہارے ابا جان پردیس گئے ہیں۔ وہ آجائیں تو کپڑے منگا دیں گے۔ دیکھو تمہارے دولہا بھائی بھی بنارس گئے ہوئے ہیں۔ وہ ہوتے تو اُن سے ہی منگا دیتے۔ اب کس کو

بازار بھیجوں"

لڑکے نے کہا کہ میں خود لے آؤں گا مجھ کو دام دو۔ دام کا نام سن کر دکھیاری بیوہ کے آنسو آ گئے۔ اُس نے کہا کہ تمہیں خبر نہیں رات کو گھر میں چوری ہو گئی' ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ ضدی شہزادے نے مچل کر کہا "نہیں! میں تو ابھی لوں گا۔ یہ کہہ کر دو چار گالیاں ماں کو دیں۔ مصیبت زدہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر آسمان کو دیکھا اور بولی۔ اچھا ٹھہرو میں منگاتی ہوں۔ یہ کہہ کر پڑوس کے گھر سے لگی ہوئی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور گوٹے والے کی بیوی سے کہا 'بو اعدت کے دن ہیں' اندر تو نہیں آ سکتی۔ ذرا میری بات سن جاؤ۔ وہ بیچاری فوراً اُس کے پاس آئی تو اُسے سارا ماجرا سنایا اور کہا: خدا واسطہ کا کام ہے۔ اپنے بچے کی اُترن' کوئی جوتی یا کپڑوں کا جوڑا ہو تو ایک دن کیلئے مانگے دے دو' کل شام کو واپس دے دوں گی۔

شہزادی اُترن کہتے وقت بے اختیار ہچکی لے کر رونے لگی۔ پڑوسن کو بڑا ترس آیا۔ اُس نے کہا بوا رونے اور جی بھاری کرنے کی کچھ بات نہیں' ننھے کی کئی جوتیاں اور کئی جوڑے فالتو رکھے ہیں۔ ایک تم لے لو۔ اِس میں اُترن کا خیال نہ کرو' اِس نے تو ایک دن یونہی ذرا پاؤں میں ڈالی تھی' میں نے سنگوا کر رکھ دی۔

یہ کہہ کر پڑوسن نے جوتی اور کپڑے شہزادی کو دیئے۔ شہزادی یہ چیزیں لے کر بچے کے پاس آئی اور اُس کو یہ سب دکھائیں۔ بچہ خوش ہو گیا۔

دوسرے دن عیدگاہ جانے کیلئے شہزادی نے بچے کو بھی گوٹہ والے پڑوسی کے ساتھ کر دیا۔ عیدگاہ پہنچ کر یتیم شہزادے نے گوٹے والے کے لڑکے سے کہا: ابے تیری ٹوپی سے ہماری ٹوپی اچھی ہے۔ گوٹہ والے کے لڑکے نے جواب دیا: چل بے اُترن کترن پر اِتراتا ہے۔ ابے یہ بھی میری ٹوپی ہے' اماں نے خیر خیرات دے دی ہے۔ یہ سنتا تھا کہ شہزادے نے زور کا تھپڑ گوٹہ والے کے بچے کو مارا اور کہا کہ ہم کو خیرات خورہ کہتا ہے۔ گوٹہ والے نے جو اپنے بچے کو پٹتا دیکھا تو اُس کو بھی غصہ آ گیا اور اُس نے دو تین طمانچے شہزادے کے مارے۔ یہ لڑکا روتا دھوتا بھاگا۔ گوٹہ والے نے خیال کیا کہ اِس کی ماں کیا کہے گی کہ ساتھ لے گئے تھے' کہاں چھوڑ آئے۔ اِس لئے وہ اِس کو پکڑنے کو دوڑا مگر لڑکا نظروں سے غائب ہو گیا۔ ناچار گوٹہ والا مجبور ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔

اب شہزادہ کی یہ کیفیت ہوئی کہ عام خلقت کے ساتھ عیدگاہ سے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ راستہ میں ایک گاڑی کی جھپٹ میں آ کر گر پڑا اور زخمی ہو گیا۔ پولیس شفاخانہ لے گئی۔

یہاں گھر میں اُس کی ماں کا عجب حال تھا۔ غش پہ غش آتے تھے۔ دو وقت سے بھوکی تھی۔ اِس پر عید اور یہ مصیبت کہ لڑکا گم ہو گیا اور عالم یہ کہ کوئی پرسان حال نہیں جو لڑکے کو تلاش کرنے جائے۔ آخر وہی بیچارہ گوٹہ والا پھر گیا اور پولیس میں اطلاع لکھوائی۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ وہ شفاخانہ میں ہے۔ شفاخانہ جا کر خبر لایا اور شہزادی کو ساری کیفیت سنائی' اُس وقت عجیب عالم تھا۔

عید کی شام تھی۔ گھر گھر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ مبارک بادوں کے چرچے تھے۔ تحفے تحائف اور عیدیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ ہر مسلمان نے اپنے حیثیت سے زیادہ گھر کو آراستہ کیا تھا اور اپنے بال بچوں کو خوش و خرم لئے بیٹھا تھا۔ مگر بیچاری شہزادی دو وقت کے فاقہ سے رنجور بچہ کے غم میں اشکبار' اندھیرے اُجاڑ گھر میں بیٹھی آسمان کو دیکھتی تھی اور کہتی تھی: خدایا! میری عید کہاں ہے؟ اور بے اختیار ہچکیاں لے کر روتی تھی۔ اُدھر شفاخانہ میں یتیم شہزادہ ماں کی جدائی میں پھڑکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

جب میں شہزادہ تھا

بمبئی کے بھنڈی بازار میں مغل ہوٹل کے برابر ایک بوڑھا آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ آنے جانے والوں نے پہلے خیال کیا کہ کوئی تھکا ہوا مسافر ہے جو اب تک سو رہا ہے' جو بھنڈی بازار کی اُن پٹڑیوں پر جن پر پیدلوں کا راستہ ہے' صبح کے وقت سینکڑوں پردیسی مسافر جن کو مکان میسر نہیں' پڑے سویا کرتے ہیں۔ لیکن جب دس بج چکے اور بڈھا بیدار نہ ہوا تو پہرہ دار سپاہی نے قریب آ کر دیکھا۔

بڈھا بہت کمزور اور ناتواں تھا۔ بچی داڑھی' بھوؤں تک بال سفید' چہرے پر جھریاں' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی' بدن پر ایک میلا کرتا' جس میں کئی پیوند' ٹانگوں میں گاڑھے کا پاجامہ۔

سپاہی نے پہلے تو جگانا چاہا اور جب وہ نہ جاگا تو قریب آ کر بڑے غور سے اُس کی صورت دیکھی اور بولا: یہ تو شاید مر گیا۔ دو تین راہ گیروں نے جھک کر بڈھے کو کروٹ دی' اُس کا چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ سانس آ رہا ہے مگر کسی وجہ سے بے ہوش ہے۔

سپاہی نے ایک وکٹوریہ گاڑی والے کو آواز دی اور بڈھے کو اُٹھا کر اُس میں لادا اور جے جے اسپتال لے گیا۔ پارسی ڈاکٹر نے بڈھے کو دیکھ کر کہا: اِس کو کسی نے کچھ کھلا دیا ہے' زہر اثر کر چکا' اب اِس کا علاج مشکل ہے۔ پھر بھی اُس نے کوشش شروع کی۔ تھوڑی دیر بڈھے کو ہوش آیا اور اُس نے کہا: بیٹی تو کہاں چلی گئی۔

بڈھے کی آواز اِس قدر ناتواں تھی کہ کمپونڈر کے سوا کسی نے نہ سنی' اِس لئے اِس نے کہا: ارے تو اب اسپتال میں ہے' تیری بیٹی یہاں نہیں ہے۔ بڈھے نے پھر مری ہوئی دھیمی آواز میں کہا: میں نے سات دن سے کچھ نہیں کھایا' مجھے کچھ کھانے کو دو۔ میری بیٹی نے کئی دن سے خبر نہیں لی' وہ مجھ کو روٹی کھلاتی تھی' خبر نہیں وہ کہاں چلی گئی۔

کمپونڈر نے ڈاکٹر سے یہ حال کہا۔ ڈاکٹر نے شوربا تجویز کیا جو تھوڑا تھوڑا کر کے اُس کو پلایا

گیا۔

جب بڈھے میں ذرا جان آئی تو پولیس والوں نے اُس کے اظہار لئے کیونکہ تھانہ کا محرر اُس کی بے ہوشی میں ایک پھیرا کر کے چلا گیا تھا۔ جب اُس کو خبر ہوئی کہ بڈھے کو ہوش آ گیا ہے تو وہ پھر آیا اور اُس نے حالات دریافت کئے۔

بڈھے نے کہا: میں چار مہینے سے بمبئی میں رہتا ہوں۔ میرا کوئی مکان نہیں ہے۔ سڑکوں پر گزارہ کر لیتا ہوں۔ میری ایک بیٹی پکانے کی نوکری کرتی ہے۔ وہ کھیت باڑی میں ایک طوائف کے ہاں نوکر تھی اور صبح شام مجھ کو اپنے حصے کے کھانے میں سے آدھا کھانا سڑک پر آ کر دے جاتی تھی مگر چار دن سے وہ نہیں آئی۔ جس مکان پر وہ نوکر تھی میں وہاں بھی گیا اور رنڈی سے اُس کا حال دریافت کیا۔ اُس نے کہا کہ وہ تو دس دن ہوئے ہماری نوکری چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ یہ سن کر میں نے اُس کو اور کئی جگہ ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہ ملی۔ جب چھ دن کا فاقہ ہو چکا اور مجھ میں چلنے کی طاقت نہ رہی تو میں بھنڈی بازار کی سڑک پر رات کو لیٹ رہا اور بے ہوش ہو گیا۔

تھانہ کے محرر نے پوچھا: تم تو بھیک مانگتے تھے۔ پھر کیوں بھوکے رہے۔ بمبئی شہر میں بھیک مانگنے والے بی اے پاس لوگوں سے زیادہ کما لیتے ہیں۔

بڈھے نے محرر کی یہ بات سنی تو اُس کو اِس قدر طیش آیا کہ آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں اور اُس نے اپنی کمزور آواز حلق سے بہت زور کے ساتھ باہر نکال کر کہا: بس جناب! چپکے رہیے' زیادہ بکواس نہ کیجئے' شاید آپ نے اپنے باوا کے ساتھ مجھ کو بھیک مانگتے دیکھا ہوگا۔

محرر کو ایک شکستہ حال کنگلے کی یہ بات تیر ہو کر لگی اور اُس نے بڈھے کو ایک طمانچہ مارا۔ بڈھا طمانچہ کھا کر چت گر پڑا مگر فوراً اُٹھا اور ڈاکٹر صاحب کا رول میز پر سے اُٹھا کر محرر کے سر پر مارا جس سے محرر کا سر پھٹ گیا اور وہ غش کھا کر گر پڑا۔ لوگوں نے بڈھے کو پکڑ لیا ورنہ وہ دوسرا وار کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر نے محرر کو ڈریسنگ روم میں لے جا کر اُس کے زخم کو دھویا اور دوا لگائی۔ سپاہی بڈھے کو لے کر تھانہ میں پہنچا۔ یورپین انسپکٹر وہاں موجود تھا۔ جب اُس نے بڈھے کے حالات سنے تو اُس کو بھی بہت غصہ آیا مگر اُس نے کہا کہ محرر کے بیان تک اِس کو حوالات میں رکھو۔

شوربا پی کر بڈھا بہت تیز ہو گیا تھا اور محرر کو برابر برا بھلا کہہ رہا تھا۔

زخم پر پٹی باندھے محرر تھانے میں آیا اور انسپکٹر کو واقعات کی رپورٹ سنائی۔ اُس نے بڈھے

کوحوالات سے نکال کر پھر اُس کے بیانات لکھنے شروع کیے۔

بڈھے نے کہا: میں بیان اُس وقت دوں گا کہ پہلے آپ کے محرر صاحب مجھ سے معافی مانگیں۔ اُنھوں نے مجھ جیسے عزت دار کو بھیک منگا کیوں کہا۔

محرر نے کہا: کیوں بکتا ہے بڑا عزت دار آیا کہیں سے۔ خود تو کہتا تھا کہ میری بیٹی رنڈی کے ہاں نوکر تھی اور اب عزت دار بنتا ہے۔ تو بھیک منگا نہیں ہے تو کوئی ٹھگ یا ڈاکو ضرور ہے۔

بڈھے پر پھر غصہ کی لہر طاری ہوئی اور قریب تھا کہ وہ محرر پر دوبارہ حملہ کرے لیکن سپاہیوں نے اُس کو پکڑ لیا اور انسپکٹر نے بڈھے کو دھمکایا کہ خبردار! اپنی جگہ کھڑے رہو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

بڈھے نے کہا: تو کیا آپ ایک شریف آدمی کو گالیوں دلوانے کو یہاں لائے ہیں۔ میں شہنشاہ دہلی کا خون ہوں' ہرگز کسی کی گالی نہیں سنوں گا اور اپنی جان اُس کی جان ایک کردوں گا۔

شہنشاہ دہلی کے خون کا لفظ سن کر انسپکٹر کو ہنسی آگئی اور اُس نے محرر سے کہا: یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ تم اِس کو بکنے دو۔

اِس کے بعد انسپکٹر نے بڈھے سے سوالات کرنے شروع کیے۔

تمہاری بیٹی کی عمر کتنی ہے؟ بڈھے نے جواب دیا: وہ بیس سال کی ہے مگر وہ میری سگی بیٹی نہیں ہے۔ میں نے اُس کو پالا ہے۔ میں نے اُس کی شادی کردی تھی مگر اُس کا خاوند انفلوائنزا کی وبا میں مرگیا۔ وہ آدم جی پیر بھائی کے کارخانہ میں نوکر تھا۔ میری لڑکی نے بھوپال میں یہ خبر سنی تو وہ اِس کو دیکھنے بمبئی میں آئی۔ میں بھی اُس کے ہمراہ آیا۔ یہاں آکر واپسی کا خرچ پاس نہ تھا۔ اِس لئے چار مہینے سے ہم بمبئی میں تھے۔ میری بیٹی نوکری کرتی ہے۔

انسپکٹر نے کہا: تم بھوپال میں کیا کام کرتے تھے۔ بڈھا بولا: میں ایک امیر کے دروازے پر چوکیدار تھا۔ میری لڑکی اُسی امیر کی چھوکری تھی۔ میں نے اُس کو بیٹی بنا لیا تھا۔

انسپکٹر نے پوچھا: شہنشاہ دہلی کا خون تمہارے اندر کے دن سے آیا' کیونکہ ابھی تم کہتے تھے کہ میں شہنشاہ دہلی کا خون ہے۔ ایک ٹکے کا چوکیدار یہ کیونکر دعویٰ کرسکتا ہے؟

بڈھے نے مسکرا کر کہا: جب سے تم یہاں آئے میں چوکیدار بن گیا۔ ورنہ تمہارے آنے سے پہلے میں شہزادہ تھا۔ انسپکٹر بڈھے کے مسکرانے سے بگڑا اور اُس نے کہا: میرے آنے سے پہلے اگر تم شہزادے تھے تو اتنی جلدی چوکیدار کیوں کر بن گئے؟ میرے سامنے پاگل پنے کی باتیں نہ کرو' میں تمہاری حقیقت کو جانتا ہوں' تم بڑے ہوشیار بدمعاش ہو۔ بڈھے نے یہ بات سنی تو اُس

کے چہرے کا رنگ بدلا مگر اُس نے بہت ضبط کے ساتھ جواب دیا: جی ہاں آپ میری حقیقت سے واقف ہیں اور میں آپ کی حقیقت سے واقف ہوں۔ میں نے ابراہیم لودھی کا گھر لوٹا تھا' اِس واسطے بدمعاش ہوں۔ آپ نے میرا گھر لوٹا ہے لہٰذا آپ بھی بدمعاش ہیں۔

انسپکٹر غصہ سے بے تاب ہو گیا مگر اُس نے مزاج کو قابو میں رکھ کر کہا: تمہارے گھر میں کتنا سونا چاندی تھا جس کو میں نے لوٹ لیا۔ بڈھے نے جواب دیا: جتنا سونا چاندی بابر اور ہمایوں نے ابراہیم لودھی کے گھر سے لوٹا تھا' وہ سب آپ کے قبضہ میں ہے۔

انسپکٹر نے کہا: تو کیا تم بابر کی اولاد ہو؟ بڈھا بولا: ہاں' میں بابر کی اولاد تھا مگر اب چوکیدار ہوں' نہیں بلکہ آپ کا قیدی ہوں۔

انسپکٹر نے اِس کے بعد کچھ نہ کہا اور حکم دیا: اِس کو حوالات لے جاؤ

(2)

بمبئی میں ایک مغلیہ خاندان کے ایک شہزادے رہتے تھے۔ گیروا لباس' تلوار لگائے ہوئے' انگریزی حکام سے بھی اُن کا ملنا جلنا تھا۔ انسپکٹر صاحب نے اُن کو بلایا اور کہا: ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں دہلی کے شاہی خاندان سے ہوں۔ کیا تم اُس کو پہچان سکتے ہو کیونکہ تم کو بھی دعویٰ ہے کہ میں شہزادہ دارا بخت ابن بہادر شاہ کا بیٹا ہوں۔

یہ شخص حوالات کے قریب گیا اور بڈھے چوکیدار کو دیکھ کر بولا: جھوٹ ہے یہ شہزادہ نہیں ہے۔ حوالات کے اندر سے بڈھے نے کہا: نہیں' تم شہزادہ نہیں ہو۔ انسپکٹر نے پوچھا: تم کس دلیل سے کہتے ہو کہ حوالات والا بڈھا دہلی کے شاہی خاندان سے نہیں ہے۔ وہ بولا: دلیل کچھ نہیں ہے۔ میں اپنے خاندان کے سب لوگوں کو جانتا ہوں۔

حوالات کے اندر سے بڈھا بولا: میں تم سے عمر میں زیادہ ہوں اور اپنے خاندان کا حال تم سے زیادہ معلوم ہے۔ بتاؤ جب بہادر شاہ گرفتار ہو کر رنگون گئے تو اُن کے ہمراہ کون کون گیا تھا۔

بمبئی والے شہزادے نے کہا: جواں بخت اور میں اور زینت محل اور بہادر شاہ ایک ٹم ٹم میں اور زینت محل دوسری میں' جواں بخت اور میں منزل بمنزل کلکتہ گئے۔ وہاں واجد علی شاہ نے موتیوں کا تھال نذر بھیجا مگر انگریزوں نے اِس کو پیش نہ ہونے دیا۔ کلکتہ سے ہم رنگون گئے اور بہادر شاہ کی رحلت کے بعد میں بمبئی چلا آیا۔

حوالاتی بڈھے نے ہنس کر کہا: یہی جھوٹ ہے کہ بادشاہ اور زینت محل ٹم ٹم میں تھی۔ دہلی کے

بچہ بچہ کو معلوم ہے کہ یہ دونوں پالکی میں تھے۔ایک پالکی میں جواں بخت اور زینت محل تھے' دوسری میں تاج محل تھیں' تیسری میں خود بادشاہ تھے۔اِن کے سوا کوئی شخص اُن کے ہمراہ نہ تھا۔

بمبئی والا شہزادہ کچھ گھبرا سا گیا کیونکہ اُس نے فرضی داستان اپنے شہزادہ ہونے کی بمبئی میں مشہور کر رکھی تھی اور لوگ اُس کی عزت کرتے تھے۔

بڈھے حوالاتی نے اور بھی چند سوالات کئے مگر کسی کا ٹھیک جواب بمبئی والا شہزادہ نے نہ دیا۔

انسپکٹر کھڑا ہوا باتیں سن رہا تھا۔اُس کو یقین ہو گیا کہ حوالاتی بڈھا سچا ہے۔اِس لئے اُس نے اُس کو حوالات سے نکال لیا اور سامنے کرسی پر بٹھا کر حالات دریافت کرنے لگا کہ غدر سے اب تک اُس پر کیا کیا گذری۔

(3)

حوالاتی بڈھے نے کہا: میں مرزا خضر سلطان کا بیٹا ہوں جو بہادر شاہ کے بیٹے تھے اور جن کو غدر کے بعد گولی سے قتل کر دیا گیا۔غدر میں میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔غدر کے زمانہ میں مجھ کو پیچش ہو رہی تھی۔چار مہینے لگاتار بیمار رہا۔جس دن میرے والد گرفتار ہوئے' میں ہمایوں کے مقبرہ میں تھا۔شام کو جب خبر آئی کہ میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان وغیرہ قتل کر دیئے گئے تو میری والدہ مجھ کو اور میری چھوٹی بہن کو لے کر فرید آباد کی طرف روانہ ہوئیں کیونکہ وہاں ہمارے دو نوکروں کا گھر تھا۔

جب ہماری بہل گاڑی بدر پور پہنچی تو میجر ہڈسن اور میرزا الٰہی بخش نے سوار لا کر ہم کو گھیر لیا۔گاڑی کی تلاشی لی اور مجھ کو گرفتار کر لیا۔میری صورت مردوں کی سی ہو رہی تھی۔خون کے دست آتے تھے۔والدہ نے رو رو کر کہا یہ بہت بیمار ہے۔اِس کا کچھ قصور نہیں ہے۔یہ تو چار مہینے سے گھر میں پڑا ہوا ہے۔میجر ہڈسن نے کہا مگر اِس کے باپ نے انگریزوں کے بچوں اور عورتوں کو قتل کرایا تھا۔ہم اِس کو قید کر کے تحقیقات کریں گے۔اگر یہ بے گناہ ہوا تو چھوڑ دیں گے ورنہ اِس کو قتل کیا جائے گا۔میری بہن مجھ سے بہت مانوس تھی۔اُس نے مجھ کو گرفتار دیکھا تو روتی ہوئی دوڑی اور مجھ کو چمٹ گئی۔صاحب نے اِس کو زبردستی ہٹایا اور مجھ کو ایک سوار کے پیچھے بٹھا کر دلی کے کیمپ میں لے آئے۔

میں والدہ اور بہن سے جدا ہوا تو دونوں زار و قطار کھڑی روتی تھیں۔والدہ نے روتے روتے اتنا کہا: بیٹا جان سے بچ گئے تو جلدی صورت دکھانا۔جاؤ اللہ بیلی اللہ نگہبان۔

تحقیقات کے زمانہ میں مجھ کو سمندر خان پنجابی سپاہی کے پاس رکھا گیا تھا جو بڑا ظالم تھا۔میں پیچش کے سبب گھڑی گھڑی پاخانہ جاتا تھا۔جب میں فارغ ہو کر آتا تو وہ کہتا' جاؤ اِس کو اپنے ہاتھ سے صاف کرو۔پہلی دفعہ میں نے انکار کیا تو اُس نے دو تین طمانچے میرے مارے۔کمزوری کے سبب مجھ کو غش آ گیا اور تمام رات بخار بھی چڑھا رہا۔اِسی حالت میں پاخانہ جاتا تھا' چکر آتے تھے' گر پڑتا تھا مگر مجبوراً پاخانہ کو ہر دفعہ صاف کر کے باہر ڈالنے جاتا تھا۔ایک دفعہ میں نے کہا کہ مجھ کو جنگل میں جانے کی اجازت دیجئے تاکہ صاف کرنے کی تکلیف سے بچ جاؤں تو اُس ظالم نے کہا کہ شاید بھاگنے کا ارادہ ہوگا' تم جنگل میں نہیں جا سکتے۔

کھانے کو بھی بہت خراب غذا ملتی تھی جس سے پیچش بڑھ گئی تھی۔چار دن کے بعد مجھ کو بڑے انگریز کے سامنے پیش کیا گیا۔گامی خاں مخبر کی گواہی ہوئی جس نے بیان کیا کہ یہ لڑکا اپنے باپ میرزا سلطان خضر کے ساتھ پہاڑی پر لڑنے جاتا تھا اور لال قلعہ میں جو انگریزوں کے بچے اور عورتیں قتل کئے گئے' یہ اُس وقت موجود تھا اور اِسی نے زنانہ محل سے باہر آ کر کہا تھا کہ بادشاہ نے اِن لوگوں کے قتل کا حکم دے دیا ہے۔

بڑے صاحب نے یہ گواہی سن کر میری پھانسی کا حکم دیا۔میں نے کہا کہ اِس گواہ سے یہ تو پوچھئے کہ پہاڑی پر باغی فوج کے ساتھ جاتے ہوئے یا لال قلعہ میں زنانہ محل سے باہر آتے ہوئے اِس نے خود مجھ کو دیکھا ہے یا سنی سنائی کہتا ہے۔

گامی خاں نے کہا: میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔میں نے پوچھا: جس روز ڈگلس صاحب قلعہ دار مارے گئے ہیں تم کہاں تھے؟ گامی خاں کا چہرہ فق ہو گیا اور اُس نے گردن جھکا لی اور کچھ دیر کے بعد کہا: میں اُس روز اپنے گھر میں تھا۔میں نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو۔تم خود باغیوں کے ساتھ موجود تھے اور تم نے ہی باغیوں کو ڈگلس صاحب کے قتل پر اُبھارا تھا۔میں اُس وقت وہاں موجود تھا کیونکہ والدہ نے پیچش کے علاج کیلئے ڈگلس صاحب کے مہمان ڈاکٹر صاحب کے پاس مجھ کو بھیجا تھا۔تم نے صاحب اور میم صاحب اور مہمانوں کے قتل کے بعد چاندی کا ایک گلدان اُٹھا لیا تھا اور صاحب کی گھڑی بھی تم نے لے لی تھی۔گامی خاں نے کہا: جھوٹے ہو' میں وہاں نہیں تھا مگر اُس کے چہرے پر ایسی گھبراہٹ تھی کہ بڑے صاحب کو شبہ ہوا اور اُنہوں نے حکم دیا کہ گامی خاں کے گھر کی تلاشی لی جائے۔چنانچہ اُسی وقت دوڑ بھیجی گئی اور کچھ دیر کے بعد گھڑی اور گلدان لئے ہوئے سپاہی واپس آئے اور اِس کے علاوہ ہزار ہا روپیہ کا اور بھی قیمتی سامان اُس

کے گھر سے نکلا۔

صاحب نے یہ دیکھ کر گامی خاں کو پھانسی کا حکم دیا اور مجھ کو رہا کر دیا۔ قید سے چھوٹ کر میں فرید آباد گیا مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ والدہ اور بہن یہاں نہیں آئیں۔ ہر چند تلاش کیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ چند روز فرید آباد میں ٹھہرا رہا۔ جب تندرستی ٹھیک ہو گئی تو منزل بہ منزل پیدل چل کر بھوپال آیا کیونکہ یہاں میرے والد کے دوستوں میں ایک امیر رہتے تھے۔ بھوپال پہنچ کر معلوم ہوا کہ اِن امیر کا انتقال ہو گیا۔ اِن کے وارثوں نے بہت بے توجہی برتی' آخر میں ایک دوسرے امیر کے ہاں چوکیداروں میں نوکر ہو گیا اور تمام زندگی اِسی جگہ گذاری۔

انسپکٹر پولیس نے یہ بیان سن کر محرر سے کہا: بے شک یہ عزت دار آدمی ہے۔ تم اِس سے معافی مانگو۔ اِس کے بعد حکم دیا کہ اِس کی بیٹی کو تلاش کیا جائے اور جب تک اِس کا حال معلوم ہوا' اُس کے کھانے کا خرچ میں دوں گا۔ چار دن کے بعد معلوم ہوا کہ کسی بدمعاش نے اُس کی لڑکی کو پکڑ کر کہیں چھپا دیا اور اُس سے بازاری پیشہ کروانا چاہتا تھا۔ مخبروں نے سراغ نکال لیا۔ بدمعاش کو سزا ہوئی اور شہزادہ لڑکی کو لے کر انسپکٹر کے خرچ پر بھوپال چلا آیا۔

چلتے چلتے شہزادہ نے انسپکٹر کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا برا نہ مانئے گا۔ میں نے سچ کہا تھا کہ بابر و ہمایوں نے ہندوستان فتح کیا تو وہ ڈاکو تھے اور اب آپ ہیں۔ آج آپ شہزادہ ہیں اور تب میں شہزادہ تھا۔

☆☆☆☆☆

جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا

جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا اور دِلّی کی محفل میں بھی شمع روشن تھی اور گل اندام بھی زندہ تھے' ایک میخوار نے جھوم جھوم کر کہا تھا:

"یارو! یہ آخری رات ہے' غنیمت جانو جو یہ چند ہم صورت اور ہم خیال جمع ہیں۔ کل یہاں کچھ بھی نہ ہوگا"

اُس وقت شہزادہ گل اندام نے انگڑائی لے کر جواب دیا تھا: "کل کی فکر میں آج کی بزم کو کیوں مکدر کرتے ہو۔ مانا کہ بہادر شاہ قلعہ چھوڑ کر چلے گئے اور صبح انگریز پہاڑی کے مورچے سے شہر کے اندر آ جائیں گے مگر جو وقت میسر ہے' اِس کو غنیمت جانو اور دو گھڑی غم ایام کو دل سے دور رکھو۔ لاؤ میاں ساقی ایک جام اور دے دو، پی لیں اور اِس آخری شمع کو ایک دفعہ جی بھر کر اور دیکھ لیں" صبح قریب تھی' پہاڑی کا مورچہ دہلی پر رات بھر گولے برساتا رہا تھا اور اب بھی توپوں کی گرج سے دِلّی کے درّ و دیوار لرز رہے تھے۔

(2)

خاص بازار کے ایک عالی شان مکان میں چند نوجوان جمع تھے۔ ستار بج رہا تھا' دور چل رہا تھا۔ چنگیروں میں پھول بھرے رکھے تھے' چاروں طرف شمع دان تھے اور اُن میں پگھلی ہوئی شمعیں جھلملا رہی تھیں۔

شہزادہ گل اندام بہادر شاہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ گلرو نواب جھجر کی برادری کا ایک نوعمر لڑکا اِس محفل رندانہ کا روح رواں تھا۔ دِلّی میں ہر شخص کو یقین تھا کہ کل دہلی مغلوب ہو جائے گی۔ بادشاہ ہمایوں کے مقبرے میں چلے گئے ہیں' انگریز سویرے آ جائیں گے۔ اِس لئے اُنہوں نے ایک آخری بہار اپنی سلطنت اور اُس کے عیش و نشاط کے دیکھنے کو یہ مجلس آراستہ کی تھی۔ تمر تمری نام کا ایک خوش گلو اور خوش رو ز ساقی بنایا گیا تھا۔ دردناک اشعار پڑھے جا رہے تھے اور موت ہر شخص

کے سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔

صبح کی اذان ہوئی' سب کھڑے ہو گئے۔ گل اندام کے ملازم نے خبر دی' دروازہ پر رتھ حاضر ہے۔ گل اندام نے ساقی کو انعام دیا' گلرو کو گلے لگا کر رخصت کیا اور رتھ میں سوار ہو کر الور کی طرف روانہ ہو گیا۔

(3)

پندرہ دن کے بعد الور میں مشہور ہوا کہ دلی سے انگریز مخبر آئے ہیں اور اُن لوگوں کی تلاش ہو رہی ہے جو بادشاہ کے قرابت دار ہیں یا غدر میں حصہ لے چکے ہیں۔

گل اندام باریک ململ کا کرتہ پہنے پنکھا ہاتھ میں لئے مکان کی چھت پر ٹہل رہا تھا کہ چند آدمی بے باکانہ کوٹھے پر آ گئے اور کہا: "صاحب عالم! آپ گرفتار ہیں' چلئے نیچے سواری حاضر ہے"

گل اندام مسکراتا ہوا نیچے آیا اور رتھ میں سوار ہو کر دلی کی طرف روانہ ہوا۔ سات آٹھ رتھوں میں قیدی سوار تھے مگر اُن میں سے کوئی مغموم معلوم نہ ہوتا تھا' سب ہنستے بولتے جا رہے تھے۔

(4)

چاندنی چوک میں سنہری مسجد کے سامنے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ انگریز عورت مرد بیٹھے تھے۔ سامنے پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔ قیدی مشکیں بندھے کھڑے تھے۔ ایک ایک کو لاتے تھے اور پھانسی پر لٹکاتے تھے۔

گل اندام کو بھی لائے' اُس کا وہی ٹھاٹھ تھا۔ شبنمی ململ کا کرتہ' ناٹ بافی جوتا' گوری رنگت' چوڑا سینہ' سرمئی بڑی بڑی آنکھیں' پتلی کمر' سرو قد' چہرہ پر تبسم' کا انداز

حاکم نے کہا: "شہزادہ گل اندام! تم پر بغاوت میں حصہ لینے کا الزام ہے' اس لئے تم کو پھانسی دی جاتی ہے"

گل اندام نے گردن موڑ کر حاکم کو دیکھا اور کہا:

"مجھے حکومت کی بغاوت و اطاعت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ البتہ خدا کا گناہ ضرور کرتا تھا۔ پیتا تھا پلاتا تھا اور ہر وقت غم ایام سے دور رہنا چاہتا تھا۔ تم کہتے ہو میں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ ہاں سچ ہے کہ میں نے خدا سے بغاوت کی تھی اور میں ہر سزا کا مستحق ہوں"

حاکم نے یہ تقریر سنی اور سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ گل اندام کو پھانسی کے تختہ پر لے گیا اور رسی

گلے میں ڈال دی۔ یکایک ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ سب لوگ ہجوم کو دیکھنے لگے جو قریب ہی ایک طرف کھڑا تھا۔ ایک بوڑھی عورت زار و قطار رو رہی ہے اور دونوں ہاتھ مل رہی ہے اور "میرا بیٹا گل اندام" کہہ کر بے قرار ہو رہی ہے۔

گل اندام نے بھی اپنی بے کس بوڑھی ماں کو نگاہ پھیر کر دیکھا کہ تختہ کھینچ گیا اور گل اندام پھانسی میں لٹک گیا۔ حاکم کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور سپاہی بھی گل اندام کی ماں کی بے تابی دیکھ کر رونے لگے۔

(5)

1930ء میں دلی کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی مگر دہلی والے نہ تھے۔ سب باہر کے لوگ یہاں آباد تھے۔ گل اندام کی لاش لال قلعہ کی کھائی میں سلیم گڑھ کے قریب دفن کی گئی تھی۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی دہلی کا رسالہ "ساقی" لئے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ یکایک اُن کو خیال آ گیا کہ میں بھی گل اندام کی آخری محفل میں شریک تھا۔ اگرچہ بچہ تھا اور خدمت گار کر رہا تھا مگر وہ سب سماں آنکھوں کے سامنے ہے اور جس دن گل اندام کو پھانسی ہوئی اور اُس کی لاش یہاں کھائی میں دفن کی گئی' اُس دن بھی موجود تھا۔ لاؤ پکار کر دیکھوں' شاید اس کھائی میں گل اندام کی کوئی ہڈی یا جسم کی خاک کا کوئی ذرہ باقی ہو اور وہ مجھ کو جواب دے۔ یہ خیال آتے ہی اُن کو غش آ گیا اور کئی گھنٹے بے ہوش پڑے رہے۔

☆☆☆☆☆

غمگین شہزادی

شہزادی کا موجودہ گھر

اِس گھر کی دیواریں کچی ہیں جن کا ایک حصہ اِسی برسات میں گر گیا ہے اور خراب ہو گیا ہے۔ دروازے پر ٹاٹ کا ایک پھٹا ہوا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے آواز دی تو نوکر بڑھیا باہر آئی اور شہزادی صاحبہ نے مجھے اندر بلا لیا۔ اِس گھر کا صحن بہت چھوٹا ہے' دو چارپائیاں مشکل سے آتی ہوں گی۔ دالان بھی اتنا مختصر ہے کہ دو چارپائیوں کی بھی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ دالان کے شمال میں ایک چھوٹی سی کوٹھری بھی ہے

جب میں اندر گیا' شہزادی صاحبہ بوریہ پر بیٹھی تھیں۔ دالان میں ایک طرف چارپائی پڑی ہوئی تھی اور اُس کے سامنے ایک بوریہ بچھا ہوا تھا جس پر بیٹھی ہوئی شہزادی صاحبہ پن کٹی میں اپنا پان کوٹ رہی تھیں۔ بوریہ بہت پرانا تھا اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ پیوند لگی ایک سفید چادر بھی چارپائی پر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ چھوٹا تھا اور ذرا میلا تھا۔ شہزادی صاحبہ کے سامنے مٹی کی ایک بدھنی رکھی تھی جس میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ شہزادی صاحبہ اِس سے اگالدان کا کام لیتی ہیں۔ اُن کی دائیں طرف پٹاری رکھی تھی جو اگرچہ بدقلعی تھی لیکن اِس پر پان کے دھبے نہیں تھے۔ دالان کی کڑیاں بہت بوسیدہ تھیں' گلہریوں اور چوہوں نے تختوں کو خراب کر رکھا تھا۔

شہزادی صاحبہ کا حلیہ

شہزادی صاحبہ کا سر بالکل سفید ہے' پلکیں اور بھویں بھی سفید ہو گئی ہیں۔ جوانی میں اُن کا قد لمبا ہوگا' اِس واسطے اب بہت جھک گئی ہیں۔ اُن کا لباس صاف ستھرا لیکن ہر کپڑے میں کئی کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ اُن کی آواز بہت صاف اور مضبوط ہے اور اُن کی بول چال نہایت میٹھی اور

موثر اور خالص اُردو میں ہوتی ہے۔ وہ نہایت تمکنت اور وقار کے ساتھ بات کرتی ہیں۔ اُن کے چہرے پر جھریاں بہت زیادہ ہیں اور جسم بھی بہت کمزور ہے۔

بات چیت

جب میں اُن کے سامنے گیا تو آداب عرض ہے' کہا۔ بولیں: "جیتے رہو' میاں جب سے آنکھیں خراب ہوئی ہیں' درگاہ شریف میں حاضر نہیں ہو سکی' تم کو کبھی دیکھا نہیں لیکن مدت سے نام سنتی ہوں۔ اب بڑی بی نے نام لیا کہ خواجہ صاحب آئے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئیں کہ جن کا نام سنتی تھی' وہ خود میرے گھر میں آ گئے۔ میرے بزرگوں کو تمہارے بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی اور میں بھی ہمیشہ سترھویں کے عرس میں جایا کرتی تھی۔ اب آنکھیں جاتی رہیں' ہاتھ پاؤں سے معذور ہو گئی۔ بتایئے کیوں کر آنا ہوا؟" میں نے کہا: "آنے کی غرض ابھی ظاہر کروں گا مگر پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو اِس مکان میں کچھ تکلیف تو نہیں ہوتی' یہ تو بہت ہی چھوٹا مکان ہے اور چھت میں جگہ جگہ سوراخ ہیں' مٹی جھڑتی ہو گی'"

بولیں: "ارے میاں! تم نے بھلا فکر کیا' جب تقدیر نے قلعے اور محل چھنوا دیئے تو اب جو کچھ بھی میسر آ جائے غنیمت ہے۔ ڈیڑھ روپیہ مہینہ کرایہ کا مکان' اِس سے اچھا اور کیا ہو گا۔ چھت سے مٹی جھڑتی ہے اور کوئی رات ایسی نہیں آتی کہ ایک دو دفعہ پلنگ کی چادر صاف نہ کرنی پڑی۔ ایک وقت تھا کہ لال قلعہ کے اندر سوتی تھی' چھت میں کسی چڑیا نے گھونسلہ بنا لیا تھا' اُس کے کچھ تنکے میرے بچھونے پر گر پڑے تو رات بھر نیند نہ آئی۔ ایک یہ وقت ہے کہ رات بھر مٹی جھڑتی ہے اور اِس تکلیف کو سہنا پڑتا ہے۔

میں نے پوچھا: "سرکار سے کچھ پنشن ملتی ہے" بولیں: "جی ہاں! دس روپیہ مہینہ مدت سے مل رہا ہے" میں نے کہا: "کچھ اور آمدنی بھی ہے" بولیں: "جی ہاں ایک مکان ہے اُس کا کرایہ سات روپیہ مہینہ آتا ہے۔ میں پہلے اُسی میں رہتی تھی مگر جب سے آنکھیں گئیں تو دس میں گزارہ نہ ہو سکا' اِس واسطے مکان کرائے پر دے دیا اور میں خود کم کرایہ کے مکان میں آ گئی۔ اب ہم دو آدمی ہیں۔ ایک یہ بڑی بی ہیں' ایک میں ہوں۔ مکان کا کرایہ اور کھانے کپڑے میں ہم دونوں کا گذارہ سترہ روپے میں ہو جاتا ہے۔ پان چھالیہ کا بھی خرچ ہے۔ نذر و نیاز کا بھی خرچ ہے"

میں نے کہا: "میرے آنے کی وجہ تو یہ ہے کہ......اور اِس کے بعد میں نے سیوا جی اور اُن کی

قوم کا سارا قصہ سنایا۔ "مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے حالات مجھے بتائیں تاکہ میں اِن کو کتاب میں لکھوں کیونکہ میں نے آپ کے خاندان کے بہت سے مردوں اور عورتوں کے حالات شائع کیے ہیں"

یہ بات سنتے ہی شہزادی صاحبہ نے پان کوٹنا چھوڑ کر میری طرف رُخ کیا اور کہا "نا میاں! مجھ کو یہ منظور نہیں کہ میرا نام گھر گھر، گلی گلی، کوچہ بکوچہ اُچھلتا پھرے"

میں نے کہا: "میں آپ کا نام شائع نہیں کروں گا، صرف حالات شائع کروں گا" جواب دیا: "وہ حالات ہی کیا ہیں فقط دو باتیں ہیں۔ ہم بادشاہ تھے اور ہم فقیر ہو گئے۔ اِس سے زیادہ پوچھو تو یہ جواب ہے کہ اب ہم مر بھی جائیں گے مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ سیوا جی کون تھا اور ہندوؤں نے ایسی جھوٹی بات کیوں کر لکھی، کیا وہ سب کے سب جاہل ہیں کہ اُن کو بیٹی اور بہن کی بھی تمیز نہیں ہے اور کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ روشن آرا بیگم حضرت شاہجہان کی بیٹی تھی، حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی نہیں تھی، بلکہ اُن کی بہن تھیں۔ پہلے تو جھوٹوں کو موت آتی تھی، اب اُن کو بخار بھی نہیں آتا۔ اے سبحان اللہ! کیا بات بنائی ہے کہ روشن آرا بیگم سیوا جی کے ساتھ بھاگ گئیں۔ یہ بات اُس وقت کہتے جب ہم اِس ملک کے بادشاہ تھے تو ذرا مزا آتا، مرے کو مارے شاہ مدار، اب کہا جب ہم ختم ہو چکے۔ مگر خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ دیکھ لینا ایک نیک اور بے گناہ شہزادی پر جھوٹی تہمت لگانے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اِن پر خدا کی مار پڑے گی اور آسمانی قہر ٹوٹے گا"

شہزادی صاحبہ کو اتنا غصہ آیا کہ وہ یہ باتیں کہہ کر چپکی ہو گئیں اور بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ اِس کے بعد اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اُنہوں نے رونے کی آواز میں کہا: "یا اللہ! ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی تھی کہ تو نے تاج و تخت بھی چھنوایا اور اب ایسی باتیں سننا پڑ رہی ہیں"

اِس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں: "کیا ہندو مسلمانوں کی غیرت مردہ ہو گئی ہے جو وہ اپنے پہلے بادشاہوں کی عورتوں کو ایسی باتیں سنواتے ہیں اور کوئی اُس کی روک تھام نہیں کرتا۔ میں نے کہا: "اب سب نیک خیال ہندو مسلمانوں کو اِس کی خبر ہو گئی ہے اور وہ ضرور کوشش کریں گے اور اِن بہتانوں کی اشاعت رک جائے گی۔ آپ کے خاندان کی طرف سے بھی ایک محضر نامہ سرکار کے پاس جانے والا ہے اور میں اِسی واسطے آیا تھا کہ آپ بھی اِس محضر نامہ پر انگوٹھے کا نشان کر دیں"

بولیں: "یہ کام مردوں کا ہے، میرے انگوٹے کے نشان سے کیا ہوگا۔ میں نشان وشان نہیں کرتی"

سرگذشت

میں نے کہا: "تو اپنے حالات بتا دیجیے۔ میں نام اور پتہ شائع نہیں کروں گا" مگر شہزادی صاحب کو اِس قدر غصہ آ گیا کہ وہ بہت چپکی بیٹھی رہیں اور پٹاری اپنے قریب سرکا کر میرے لئے پان کا ایک ٹکڑا بنایا اور ٹھنڈا سانس لے کر بولیں:

"میاں! غدر میں میری عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ ہم قلعہ کے اندر رہتے تھے۔ بادشاہ سلامت ہمارے خاندان سے کچھ ناراض تھے لیکن ہماری تنخواہ مہینہ کے مہینہ مل جاتی تھی۔ میرے تین بھائی تھے اور بہن فقط ایک میں تھی۔ والد نے آخر عمر میں ایک شادی کر لی حالانکہ میری اماں بھی زندہ تھیں اور اِس بڑھاپے کی شادی کی وجہ سے میری اماں اور سوکن میں لڑائی جھگڑا بھی رہتا تھا اور ہم تینوں بہن بھائیوں بھی سوتیلی ماں سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ مگر مجھ سے سوتیلی ماں کو بہت محبت تھی اور میں اپنی سگی اور سوتیلی اماں کی لاڈلی بیٹی کہلاتی تھی۔

ہمارے گھر میں کئی عورتیں اور کئی مرد خدمت گاری پر نوکر تھے۔ غدر سے چھ مہینے پہلے میری سوتیلی ماں کو ہیضہ ہوا، وہ مر گئیں اور میرے دو بھائی بھی اِسی زمانہ میں ہیضہ سے مر گئے اور جب غدر ہوا ہے تو ہم صرف دو بہن بھائی اور ایک ابا حضرت اور ایک اماں حضرت موجود تھے۔

بادشاہ سلامت قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرہ میں چلے گئے اور بھی سب قلعہ کے رہنے والے باہر نکل گئے اور قلعہ خالی ہو گیا مگر ہمارا مکان قلعہ کی عمارتوں سے ذرا الگ تھا اور بہت مضبوط تھا۔ اِس لئے ابا حضور راضی نہیں ہوئے اور اُنہوں نے کہا: "باہر جائیں گے تو وہاں بھی مریں گے اور باہر کا مرنا بے غیرتی کا مرنا ہوگا۔ اِس واسطے یہیں گھر میں رہو۔ جو خدا کو منظور ہوگا، اِسی گھر میں ہوگا۔ بادشاہ سلامت کے جانے کے دو دن تک ہمارے گھر میں کوئی نہیں آیا۔ باہر کے نوکر اور گھر کی مامائیں سب بھاگ گئے۔ ہم نے گھر کے دروازے بند کر لئے تھے۔ ڈیوڑھی میں تین چار دروازے تھے اور موٹی موٹی کنڈیاں، بھاری کواڑ اُن میں لگے ہوئے تھے۔ تیسرے دن مکان کے باہر گھوڑوں کی ٹاپوں اور بہت سے آدمیوں کے بولنے کی آوازیں آئیں اور کسی نے دروازے توڑنے شروع کیے۔ میرے بھائی کی عمر سولہ برس کی تھی۔ ابا حضرت اور اماں حضرت نے فوراً وضو

کیا اور بھائی سے کہا: "میاں! اُٹھو تم بھی وضو کرو کہ مرنے کا وقت آ گیا" یہ بات سن کر میرا دل دہل
گیا اور میں اماں حضرت سے جا کر لپٹ گئی۔ وہ رونے لگیں اور مجھ کو پیار کیا اور کہا: "گھبراؤ
نہیں، اللہ مددگار ہے، شاید وہ کوئی صورت جان بچنے کی نکال دے۔ اِس کے بعد اُن سب نے وضو
کیا اور ترت ہم سب نے مصلے بچھا کر اور سجدے میں سر جھکا کر اللہ میاں سے دُعائیں مانگنی شروع
کر دیں۔

دروازے توڑنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ ہم سب سجدے میں ہی تھے کہ دس بارہ
گورے اور دس بارہ سکھ بندوقیں لئے ہوئے جن پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں، گھر کے اندر آ گئے۔ ابا
حضرت اور بھائی سجدے سے فوراً کھڑے ہو گئے۔ اماں حضرت نے مجھ کو گود میں لے کر چادر سے
منہ چھپا لیا۔ ایک سکھ نے ابا حضرت سے پوچھا: "تم کون ہو اور یہاں کیوں بیٹھے ہو" ابا حضرت
نے جواب دیا: "یہ میرا گھر ہے اور میں اِسی میں رہتا ہوں۔ شاہ عالم بادشاہ کی اولاد میں سے ہوں"
اُس سکھ نے انگریز افسر کو یہ بات سمجھائی۔ انگریز افسر نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا جس کو میں نہیں
سمجھی تو پھر اُس سکھ نے ابا حضرت کو سمجھایا کہ صاحب کہتے ہیں کہ بادشاہ بھاگ گئے اور سب لوگ
بھاگ گئے، تم کیوں نہیں بھاگے" ابا حضرت نے کہا: "بادشاہ ہم سے کچھ ناراض تھے۔ اِس واسطے
نہ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے نہ ہم اُن کے ساتھ گئے اور ہم نے سپاہیوں کے بلوہ میں بھی کچھ
حصہ نہیں لیا اور ہمیں یقین تھا کہ انگریز سرکار بے گناہ آدمیوں کو نہیں ستاتی۔ ہم بے گناہ تھے، اِس
واسطے نہیں بھاگے" انگریز افسر نے کہا: "تم کو پہاڑی پر چلنا ہوگا، ہم تحقیقات کریں گے، اگر تم بے
گناہ معلوم ہوئے تو تم کو جان کی امان ملے گی" ابا حضرت نے کہا: "میرے ساتھ میری بیوی ہے اور
ایک چھوٹی بچی ہے اور یہاں کوئی اور سواری نہیں ہے اور اِن عورتوں کو پیدل چلنے کی عادت نہیں
ہے" انگریز افسر نے جواب دیا: "اِس لڑائی کے وقت ہم تمہارے لئے سواری کا انتظام نہیں
کر سکتے۔ اگر تم یہاں ٹھہرے رہے تو ڈر ہے کہ دوسرے سپاہی آ جائیں گے اور بے خبری میں تم کو
مار ڈالیں گے۔ اِس واسطے تم کو جلدی یہاں سے روانہ ہو جانا ضروری ہے۔ ہم دو سپاہی تمہارے
ساتھ کریں گے۔ اگر راستہ میں کوئی سواری مل جائے گی تو تمہاری عورت اور تمہاری لڑکی اُس میں
بیٹھ جائیں گے۔ نہیں تو اُن سب کو پیدل چلنا ہوگا"

مجبوراً ابا حضرت تیار ہوئے اور اُنہوں نے کچھ قیمتی زیورات اور جواہرات اپنے ساتھ لے
کر باقی سارا سامان گھر میں چھوڑ دیا اور فوج والوں کے ساتھ گھر سے باہر نکلے۔ اماں حضرت

ہمیشہ بیمار رہتی تھیں اور بہت کمزور تھیں۔ مجھ کو بھائی نے گود میں اُٹھا لیا اور ابا حضرت نے اماں کا
ہاتھ پکڑ لیا اور ہم نے اپنے بھرے پرے گھر کو حسرت کے ساتھ ایک نظر اُٹھا کر دیکھا کہ پھر ہم
یہاں کبھی نہیں آئیں گے اور ایسا ہی ہوا کہ ہم پھر کبھی وہاں نہیں گئے۔

جب ہم گھر سے باہر نکلے تو وہ انگریز اور سکھ گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور دو سکھ سواروں کو
ہمارے ساتھ پہاڑی کی طرف بھیج دیا اور وہ خود کسی اور طرف گھوڑے دوڑا کر چلے گئے۔

قلعہ کے دروازے تک تو وہ سکھ سوار آہستہ آہستہ چلتے رہے اور اُنہوں نے ابا حضرت اور
اماں حضرت سے کچھ نہیں کہا کیونکہ اماں حضرت سے چلا نہ جاتا تھا اور وہ ہر دس قدم کے بعد بیٹھ
جاتی تھیں اور رعشہ سے اُن کا بدن کانپ رہا تھا۔ جب اماں حضرت بیٹھ جاتیں تو وہ سکھ سوار بھی ٹھہر
جاتے۔ لیکن جب ہم قلعہ کے دروازے کے باہر پہنچ گئے تو اُن سواروں نے سخت کلامی شروع کی
اور کہا: "اِس طرح تو شام ہو جائے گی، تم جلدی جلدی کیوں نہیں چلتے" والد نے نرمی سے جواب
دیا: "بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ ایک بیمار اور کمزور عورت ہے جو ساری عمر کبھی پیدل نہیں
چلی۔ ہم شرارت اور سرکشی سے ایسا نہیں کرتے، عورت اور بچہ کی وجہ سے مجبور ہیں" سوار یہ سُن کر
خاموش ہو گئے مگر میرے بھائی کے منہ سے بے اختیار یہ بات نکلی کہ تم ہمارے ملک کے ہو، تم کو رحم
نہیں آتا۔ اِس پر ایک سکھ سوار نے کہا: ہم کیا کریں، حاکم کا حکم ہے۔ بھائی نے کہا: حاکم نے یہ نہیں
کہا کہ ہم پر ایسی سختی کرنا۔ سکھ سوار نے جواب دیا: ہم نے کونسی سختی کی لیکن اب سختی کرنی پڑے گی، تم
لوگ جان کر چلنے میں دیر لگاتے ہو۔ یہ کہہ کر ایک سوار ہمارے پیچھے آ گیا اور ایک آگے ہو لیا۔ اماں
حضرت گھوڑے کو اپنے پیچھے دیکھ کر گھبرا گئیں، اُن کو اختلاج کا مرض تھا اور یکا یک اختلاج کا دورہ
شروع ہو گیا اور وہ نڈھال ہو کر گر پڑیں اور اُن کے منہ سے بے اختیار ہائے ہائے نکلنی شروع
ہوئی۔ سکھ سوار یہ حالت چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا اور کچھ دیر کے بعد اُس نے ابا حضرت سے
کہا: میں پیدل چلتا ہوں تم اِس بیمار عورت کو لے کر گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ ابا حضرت نے اماں
حضرت کو گود میں اُٹھا لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چلے اور وہ بے چارہ سکھ سوار پیدل پہاڑی تک گیا
اور میں بھائی کی گود میں پہاڑی پر پہنچی۔

پہاڑی پر انگریزوں کی فوج چاروں طرف ٹھہری ہوئی تھی۔ ہم کو بھی ایک خیمہ میں ٹھہرا
دیا گیا اور اُن سکھ سواروں نے فوجی لانگری سے روٹی لا کر دی اور وہ رات ہم نے اِسی خیمہ میں
گزاری۔ دوسرے دن صبح فوج کے جرنیل نے ہم سب کو اپنے سامنے بلا لیا۔ دہلی کا کوئی مخبر اُس

انگریز کے پاس کھڑا تھا۔ اُس سے پوچھا: تم اِن کو جانتے ہو؟ اُس مخبر نے کہا: ہاں جانتا ہوں۔ یہ بادشاہ کے خاندان سے ہیں اور جب لال قلعہ کے اندر انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تو اِس شخص نے اُن کے قتل کرانے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ سُن کر جرنیل نے ابا حضرت کی طرف بہت غصہ کی نظر سے دیکھا۔ ابا حضرت نے جواب دیا کہ یہ شخص جھوٹ بولتا ہے۔ یہ پہلے میرے ہاں نوکر تھا اور چوری کے الزام میں میں نے اِس کو ایک دفعہ بہت پٹوایا تھا اور نوکری سے موقوف کر دیا تھا، اِس واسطے دشمنی سے یہ ایسا کہتا ہے۔ آپ اِس سے اتنا پوچھیے کہ بہادر شاہ بادشاہ کتنے سال سے مجھ سے ناراض تھے اور میرا اسلام کتنا عرصہ سے بند تھا۔ مخبر نے جواب دیا: یہ ٹھیک ہے کہ اِن کے ہاں نوکر تھا مگر یہ غلط ہے کہ مجھے چوری کے الزام میں اُنہوں نے پٹوایا تھا۔ میں نے خود ہی اِن کی نوکری چھوڑ دی تھی کیونکہ یہ تنخواہ کم دیتے تھے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ بادشاہ اِن سے ناراض تھے لیکن جب غدر ہوا تو اُنہوں نے بادشاہ کو خوش کرنے کیلئے اُن کے پاس جانا آنا شروع کیا اور جس دن انگریز قتل کیے گئے تو یہ اور اِن کا لڑکا دونوں بہت کوشش کر رہے تھے اور اِن لوگوں سے حجت بازی کرتے تھے جو انگریز بچوں اور عورتوں کے قتل کے خلاف رائے دے رہے تھے کہ یہ بات اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اُس وقت اِن دونوں نے یہ کہا کہ سانپ کو مارنا اور اُس کے بچوں کو چھوڑ دینا عقل مندوں کا کام نہیں ہے اور محض اِن دونوں کے کہنے سے اِن عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔ یہ سن کر جرنیل غصہ سے آگ بگولا ہو گیا اور اُس نے پھر ابا حضرت کی کچھ بات نہ سنی، حالانکہ وہ برابر کہتے رہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے مگر جرنیل کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ اُس نے کوئی بات نہ سنی اور حکم دیا کہ ابھی اِن دونوں کو گولی سے اُڑا دو اور پھر یہ کہا کہ اگرچہ اِن دونوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کو قتل کرایا مگر ہم رحم کرتے ہیں اور اِس کی عورت اور بچی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اِن دونوں کو چھاؤنی سے نکال دو۔ یہ جہاں چاہیں چلی جائیں۔

قتل کا وقت

سپاہی گورے اور دیسی آگے بڑھے اور اُنہوں نے بھائی اور ابا حضرت کے ہاتھ پکڑ کر کمر کے پیچھے باندھے۔ ابا حضرت مجھ کو دیکھ کر رونے لگے مگر بھائی چپکے کھڑے رہے۔ اماں حضرت نے ایک چیخ ماری اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ میں دوڑی کہ ابا حضرت کو چمٹ جاؤں مگر ایک سپاہی نے مجھ کو زور کا دھکا دیا اور میں اماں حضرت کے اُوپر گر پڑی اور میں نے دیکھا کہ ابا حضرت

اور بھائی کو سپاہی کھینچتے ہوئے دُور لے گئے اور اُن کے سامنے پانچ چھ سپاہی بندوقیں لے کر کھڑے ہو گئے اور اُن کے پاس جرنیل بھی کھڑا ہو گیا اور اُس نے زور زور سے باتیں کیں جن کو میں سمجھ نہ سکی۔ اِس کے بعد سپاہیوں کو اشارہ کیا اور سپاہیوں نے اپنی بندوقیں کندھوں پر رکھیں اور بندوقوں کا منہ ابا حضرت اور بھائی کی طرف کیا۔ اُس وقت ابا حضرت کی آواز آئی اور اُنہوں نے میرا نام لے کر پکارا اور کہا: "لو بیٹی! اللہ بیلی! ہم دنیا سے جاتے ہیں! اور بھائی کی آواز آئی: اماں! اماں! مجھ سے تمہاری تنہائی نہیں دیکھی جاتی، سلام میں مرتا ہوں۔

بندوقوں کی آواز آئی اور بہت سا دھواں نکلا، میں نے دیکھا کہ بھائی اور ابا خاک میں لوٹ رہے ہیں۔ میں رو رہی تھی اور میرا دل ڈر کے مارے بیٹھا جاتا تھا۔ اماں کو ذرا ہوش آیا اور میں نے اُن سے کہا: بھائی اور ابا کو مار ڈالا، وہ دیکھو خاک میں تڑپ رہے ہیں، اے ہے اماں جان اُن کے سینہ سے خون اُبل رہا ہے۔ اب میرے بھائی اور ابا مجھ سے بچھڑ گئے، اب وہ مجھ سے کبھی نہیں ملیں گے۔ بابا نے تو مجھ کو پکارا بھی تھا اور بھائی نے تم کو پکارا تھا، اچھی اماں! اب کیا ہوگا۔ کیا یہ ہم کو بھی مار ڈالیں گے۔ کیا یہ ہم کو قیدی بنا لیں گے۔ اماں دونوں ہاتھوں کو ٹیک کر سہارے سے اُٹھیں اور اُنہوں نے بھائی اور ابا حضرت کی لاشوں کو غور سے دیکھا۔ اُن کا تڑپنا بند ہو گیا تھا اور بے تاب ہو کر کہا، میرا بیٹا! میرا لال! میری سولہ برس کی محنت!!! میری زندگی کا آخری سہارا!!!! میرا دولہا مجھ سے چھین گیا، میں مٹ گئی، میرا اِس دنیا میں کچھ نہیں رہا۔ میں دنیا میں آئی تھی، میں دنیا میں نہیں آئی تھی، یا اللہ! یہ خواب ہے یا سچ مچ مجھ پر مصیبت آئی ہے۔ میرا سر تاج خاک میں مل گیا، وہ بھی جوان بیٹے کے پاس خون میں نہایا ہوا پڑا ہے۔ اے مخبر! خدا تجھ کو غارت کرے، تو نے بالکل جھوٹ بولا، یہ دونوں غدر کی شروعات سے آخر تک گھر سے بھی نہیں نکلے۔ ارے تو نے کس دن کا بدلہ لیا، مجھ بیمار دکھیا پر بھی تجھ کو رحم نہ آیا، تو نے اِس معصوم بچی کا بھی خیال نہ کیا اور ہماری وارثوں کو بے خطا اور بے قصور خون میں ڈبو دیا۔ اماں یہ کہہ رہی تھیں کہ دیسی فوج کے سپاہی آئے اور مجھ کو اور اماں کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور کھینچتے ہوئے لے چلے۔ ہم دونوں لاشوں کے پاس سے گزرے، گولیاں سینوں پر اور چہروں پر لگی تھیں۔ خون نے سب کو چھپا دیا تھا اور لاشیں چپ چاپ پڑی تھیں۔ سپاہی ہم کو کشاں کشاں لیے جا رہے تھے۔ نہ اماں چل سکتی تھیں نہ میں چل سکتی تھی۔ مگر وہ رسیوں کی طرح ہم کو کھینچے لئے جا رہے تھے۔ پہاڑی کے پتھروں سے ہمارے پاؤں لہولہان ہو گئے تھے اور میں نہیں کہہ سکتی کہ دنیا میں جیسی تکلیف اُس وقت ہمیں تھی، ایسی تکلیف کسی اور کو پیش آ سکتی ہے۔

فوجی چھاؤنی سے باہر لا کر سپاہیوں نے ہم کو چھوڑ دیا۔ اماں بالکل بے ہوش پڑی تھیں اور میں اُن کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک گھسیارا گھاس کی گٹھڑی لئے ہوئے وہاں سے گزرا اور میرے پاس آیا اور اُس نے گٹھڑی سر سے اُتار کر اماں کو دیکھا اور کہا: یہ عورت تو مرگئی۔ وہ ہندو تھا' مجھ کو وہاں چھوڑ کر چھاؤنی میں گیا اور وہاں سے دو تین مسلمان گھسیاروں کو لایا اور اُن سب نے کہا: یہ عورت مرگئی۔ اُنہوں نے میرے اور میری اماں کے ہاتھوں سے اور گلے سے زیور اُتار لیا اور کہا کہ جب اُن کے مردمارے گئے تو اُن کے پاس سے بہت سے جواہرات نکلے اور وہ سب سرکاری خزانہ میں گئے مگر یہ ہمارا حق ہے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے گڑھا کھود کر اماں کو دبا دیا اور دو آدمی مجھ کو اُٹھا کر اجمیری دروازے کی طرف لائے اور یہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اکیلی بیٹھی رو رہی تھی کہ خانم کے بازار کے مسلمان سنار اپنی عورتوں کو لئے ہوئے وہاں آئے جو قطب صاحب جا رہے تھے اور وہ مجھ کو بھی اپنے ساتھ قطب صاحب لے گئے۔

اور جب شہر میں امن وچین ہو گیا اور وہ مسلمان سنار بھی دہلی میں واپس آئے تو مجھ کو میرے رشتہ کے چند شہزادوں کے حوالے کر دیا اور میں اُنہی کے پاس رہ کر بڑی ہوئی اور اُنہیں میں میری شادی ہوئی اور شادی کے بعد میری پنشن ہو گئی۔ خدا نے مجھے کئی بچے دیئے مگر کوئی زندہ نہ رہا یہاں تک کہ شوہر کا بھی انتقال ہو گیا اور اب چار سال سے آنکھیں بھی جاتی رہیں۔

سن لیا میاں' مجھ دکھیا غمزدہ کی یہ کہانی ہے۔ میرے رونگ رونگ سے ہائے کی آوازیں آتی ہیں۔ میں نے اِس دنیا میں بس دس برس کی عمر تک عیش دیکھا اور ستر برس مصیبتیں اُٹھائیں۔ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں' آج مری کل دوسرا دن۔ یہ بڑی بی بیچاری مل گئی ہیں' بازار سے ضرورت کی چیزیں خرید لاتی ہیں اور رات دن پاس بیٹھی رہتی ہیں اور ہم دونوں آخری عمر کے یہ غمگین دن مل جل کر بول چال کر' جس طرح ہوتا ہے' گزار رہی ہیں۔

☆☆☆☆☆

یتیم شہزادے کی ٹھوکریں

ماہ عالم ایک شہزادے کا نام تھا جو شاہ عالم بادشاہ دہلی کے نواسوں میں تھا اور غدر میں اُس کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ شہزادہ ماہ عالم کے باپ مرزا نوروز حیدر دیگر خاندان شاہی کی طرح بہادر شاہ کی سرکار سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے مگر اُن کی والدہ کے پاس قدیم زمانے کا بہت سا اندوختہ تھا۔ اِس لئے اُن کو اِس روپے کی چنداں پروا نہیں تھی اور وہ بڑی بڑی تنخواؤں کے شہزادوں کی طرح گذراوقات کرتے تھے۔

جب غدر پڑا تو ماہ عالم کی والدہ بیمار تھیں۔ علاج ہو رہا تھا مگر مرض برابر ترقی کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عین اُس روز جبکہ بہادر شاہ قلعہ سے نکلے اور شہر کی تمام رعایا پریشان ہو کر چاروں طرف بھاگنے لگی' ماہ عالم کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایسی گھبراہٹ کے موقع پر سب کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے' اِس موت نے عجیب ہراس پیدا کر دی۔ اُس وقت نہ کفن کا سامان ممکن تھا نہ دفن کا' نہ غسل دینے والی عورت میسر آ سکتی تھی' نہ کوئی مردے کے پاس بیٹھنے والا تھا۔ شہزادوں میں رسم ہو گئی تھی کہ وہ مردے کے پاس نہ جاتے' سب کام پیشہ وروں سے لیا جاتا تھا جو اِس وقت کیلئے ہمیشہ موجود تیار رہتے تھے۔ غدر کی عالمگیر مصیبت کے سبب کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو تجہیز وتکفین کی خدمت انجام کو پہنچاتا۔ گھر میں دو لونڈیاں تھیں لیکن وہ بھی مردے کو نہلانا نہیں جانتی تھیں۔ خود مرزا نوروز حیدر اگر چہ پڑھے لکھے شخص تھے مگر چونکہ اُن کو ایسا کام پیش نہ آیا تھا' اِس لئے اسلامی طریق پر غسل وکفن سے وہ واقفیت نہ رکھتے تھے۔

القصہ اِن لوگوں کو اِسی حیرانی وپریشانی میں کئی گھنٹے گذر گئے۔ اتنے میں سنا کہ انگریزی لشکر شہر میں گھس آیا ہے اور اب عنقریب قلعہ میں آیا چاہتا ہے۔ اِس خبر سے مرزا کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے اور جلدی سے لاش کو چارپائی پر کپڑے اُتار کر نہلانا شروع کیا۔ نہلایا کیا' بس پانی کے لوٹے بھر بھر کر اُوپر ڈال دیئے۔ کفن کہاں سے ملتا' شہر تو بند تھا۔ پلنگ پر بچھانے کی دو اُجلی

چادریں لیں اور اُن میں لاش کو لپیٹ دیا۔ اب یہ فکر ہوئی کہ دفن کہاں کریں' باہر لے جانے کا موقع نہیں۔ اِسی سوچ میں تھے کہ گوروں اور سکھوں کی فوج کے چند سپاہی گھر میں آ گئے اور آتے ہی مرزا اور اُن کے لڑکے ماہ عالم کو گرفتار کر لیا۔ اِس کے بعد گھر کا سامان لوٹنے لگے۔ صندوق توڑ ڈالے' الماریوں کے کواڑ اُکھیڑ دیئے' کتابوں کو آگ لگا دی۔ دونوں لونڈیاں غسل خانوں میں جا چھپی تھیں۔ ایک سپاہی کی اُن پر نگاہ پڑ گئی۔ جس نے دیکھتے ہی اندر گھس کر سر کے بال پکڑے اور بیچاریوں کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اگرچہ اِن فوجیوں کو لاش کا حال معلوم ہو گیا مگر اُنہوں نے اِس کی مطلق پروانہ کی اور برابر لوٹ مار کرتے رہے۔ آخر قیمتی سامان کی گٹھڑیاں لونڈیوں اور خود مرزا حیدر اور اُن کے لڑکے ماہ عالم کے سر پر رکھیں اور بکریوں کی طرح اُن کو ہانکتے ہوئے گھر سے باہر لے چلے۔ اُس وقت مرزا نے اپنے لٹے ہوئے گھر کو آخری حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اپنی بیوی کے بے گور و کفن لاش کو اکیلا چارپائی پر چھوڑ کر ظالم سپاہیوں کے ساتھ کوچ کیا۔

لونڈیوں کو تو بوجھ اُٹھانے اور چلنے پھرنے کی عادت تھی۔ مرزا نوروز حیدر بھی قوی اور توانا تھے' بوجھ سر پر اُٹھائے بے تکان چل رہے تھے مگر غریب ماہ عالم کی بری حالت تھی۔ اول تو اُس کے سر پر بوجھ اُس کی عمر اور بساط سے زیادہ تھا۔ اِس کے علاوہ یہ شہزادہ قدرتی طور پر نہایت نازک اور کمزور واقع ہوا تھا۔ اِس پر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ماں کے مرنے کا غم تھا۔ رات سے روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ خالی ہاتھ چلنے سے چکر آتے تھے' کجا یہ نوبت یہ سر پر بوجھ' پیچھے چمکتی ہوئی تلواریں اور جلدی چلنے کی قہرناک تاکید' بیچارے کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ دم چڑھ گیا' بدن پسینہ پسینہ ہو گیا تھا۔ آخر نہایت مجبوری کی حالت میں باپ سے کہا: ''ابا حضور! مجھ سے تو چلا نہیں جاتا' گردن بوجھ کے مارے ٹوٹی جاتی ہے' آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں گر پڑوں'' باپ سے اپنے لاڈلے اکلوتے بیٹے کی یہ مصیبت بھری باتیں سنیں نہ گئیں اور اُس نے مڑ کر سپاہی سے کہا: ''صاحب! اِس بچے کا اسباب بھی مجھ کو دے دو' یہ بیمار ہے گر پڑے گا'' گورا مرزا کی زبان بالکل نہ سمجھا اور اِس طرح ٹھہرنے اور بات کرنے کو گستاخی اور بدنیتی سمجھ کر دو تین مکے کمر میں مارے اور آگے دھکا دے دیا۔ مظلوم مرزا نے مار بھی کھائی مگر ممتا کے مارے لڑکے کا بوجھ بغل میں لے لیا۔ گورے کو یہ حرکت بھی پسند نہ آئی اور اُس نے جبراً مرزا سے گٹھڑی لے کر ماہ عالم کے سر پر رکھ دی اور ایک گھونسا اُس بیکس و ناتواں کے بھی مارا۔ گھونسا کھا کر ماہ عالم آہ کہہ کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ مرزا نوروز حیدر اپنے لخت جگر کی حالت دیکھ کر ہوش میں آ گئے اور اسباب

پھینک کر ایک مکا گورے کے کلے پر رسید کیا اور پھر فوراً ہی دوسرا گھونسہ اس کی ناک پر مارا جس سے گورے کا ناک کا بانسہ پھٹ گیا اور خون کا فوارہ چلنے لگا۔ سکھ سپاہی دوسری طرف چلے گئے تھے۔ اُس وقت فقط دو گورے اِن قیدیوں کے ساتھ تھے اور کیمپ کو لئے جا رہے تھے۔ دوسرے گورے نے اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھ کر مرزا کے ایک سنگین ماری مگر خدا کی قدرت سنگین کا وار اوچھا پڑا اور وہ مرزا کی کمر کے پاس سے کھال چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ تیموری شہزادے نے اِس موقع کو غنیمت جانا اور ایک اور مکا اُس گورے کی ناک پر مارا۔ یہ مکا بھی ایسا کاری پڑا کہ ناک پچک گئی اور خون بہنے لگا۔ گورے یہ حالت دیکھ کر پستول و کرچ تو بھول گئے اور ایک بار کی دونوں کے دونوں مرزا کو چمٹ گئے اور گھونسوں سے مارنے لگے۔ لونڈیوں نے جو یہ حالت دیکھی تو اسباب پھینک کر رستہ کی خاک مٹھیوں میں بھر کر گوروں کی آنکھ میں جھونک دی۔ اِس ناگہانی آفت سے گورے تھوڑی دیر کیلئے بیکار ہو گئے اور اُن کی کرچ مرزا کے ہاتھ آ گئی۔ مرزا نے فوراً کرچ گھسیٹ لی اور ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ کرچ نے شانے سے سینہ تک کاٹ ڈالا۔ اِس کے بعد دوسرے گورے پر حملہ کیا اور اُسے بھی ذبح کر دیا۔ اُن دونوں کو ہلاک کر کے ماہ عالم کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ بالکل بے ہوش تھا۔ باپ کے گود میں لیتے ہی آنکھیں کھول دیں اور باہیں گلے میں ڈال کر رونے لگا۔ مرزا اِسی حالت میں تھے کہ پیچھے سے بارہ گورے اور سکھ سپاہی آ گئے اور اُنہوں نے اپنے دو ساتھیوں کو خون میں نہایت ہوا دیکھ کر مرزا کو گھیر لیا اور لڑکے سے جدا کر کے حال پوچھا۔ مرزا نے سارا واقعہ سچ کہہ دیا۔ یہ سنتے ہی گوروں کی حالت غیر سے غیر ہو گئی۔ اُنہوں نے پستول کے چھ فائر ایک دم کر دیئے جن سے مرزا زخمی ہو کر گر پڑے اور آناً فاناً میں تڑپ کر مر گئے۔ مرزا نوروز کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور ماہ عالم کو لونڈیوں سمیت پہاڑی کے کیمپ میں لے گئے۔

جب دہلی کی فتح سے اطمینان ہو گیا تو لونڈیاں دو پنجابی افسروں کو دے دی گئیں اور ماہ عالم ایک انگریزی افسر کی خدمت گاری پر مامور ہوئے۔ جب تک یہ انگریز دہلی میں رہے' ماہ عالم کو زیادہ تکلیف نہ تھی کیونکہ صاحب کے پاس کئی خانساماں اور نوکر چاکر تھے۔ اِس واسطے زیادہ کام کاج نہ کرنا پڑتا تھا لیکن چند روز کے بعد یہ صاحب رخصت لے کر ولایت چلے گئے اور ماہ عالم کو ایک دوسرے افسر کے حوالے کر گئے جو میرٹھ چھاؤنی میں تھے۔ اِس افسر کا مزاج سخت تھا' بات بات پر ٹھوکریں مارتے تھے' ماہ عالم اِس مار دھاڑ کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن بھاگنے کا ارادہ

کیا۔ چنانچہ پچھلی رات کو گھر سے نکلے۔ پہرہ دار نے ٹوکا تو کہہ دیا کہ فلاں صاحب کا نوکر ہوں اور اُن کے کام کو فلاں گاؤں جاتا ہوں تاکہ سویرے ہی پہنچ جاؤں۔ اِس حیلہ سے جان بچائی اور جنگل کا راستہ لیا۔

چھوٹی عمر' راستے سے بے خبر' پکڑے جانے کا خوف' عجب پریشانی کا عالم تھا۔ آخر بزارِ وقت صبح ہوتے ہوئے میرٹھ سے تین چار کوس کے فاصلہ پر پہنچ گئے۔ سامنے گاؤں تھا' وہاں جا کر ایک مسجد میں پچھلی رات گئے کو گھر صاحب نکلے نے یہ حالات شہر ٹوکا تو کہہ دیئے کہ فلاں صاحب کہا کا نوکر ہے آیا ہے' کہاں جائے گا۔ ماہ عالم نے اِن باتوں کو باتوں میں ٹالا۔ یہاں ایک فقیر بھی ٹھہرے ہوئے تھے' اُنہوں نے ماہ عالم کی شریفانہ صورت دیکھی تو محبت سے پاس بلایا اور رات کی بچی ہوئی روٹی سامنے رکھی۔ ماہ عالم نے شاہ صاحب کو ہمدرد پا کر اپنی مصیبت کی داستان اول سے آخر تک سنائی۔ شاہ صاحب یہ کیفیت سُن کر رونے لگے اور ماہ عالم کو سینہ سے لگا کر پیار کیا اور تسلی کی باتیں کرنے لگے۔ اِس کے بعد کہا کہ اب تم فکر نہ کرو۔ میرے ساتھ رہو۔ خدا حافظ و ناصر ہے۔

چنانچہ اُنہوں نے ایک رنگین کرتا اُن کو پہنا دیا اور ساتھ لے کر چل کھڑے ہوئے۔ دو چار روز تو یہ حالت رہی کہ جہاں ماہ عالم نے کہا حضرت اب تو میں تھک گیا ہوں تو کسی گاؤں میں ٹھہر جاتے۔ لیکن پھر اُن کو بھی چلنے کی عادت ہوگئی اور پوری منزل چلنے لگے۔ مہینے بھر میں اجمیر شریف پہنچے۔ یہاں اُن صاحب کے پیر جو بغداد کے رہنے والے تھے' صاحب کو جب ماہ عالم کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی مہربانی سے پیش آئے اور اِن دونوں کو ساتھ لے کر بمبئی چلے گئے۔ بمبئی کے قریب باندرہ میں شاہ صاحب رہتے تھے' وہیں اِن کو بھی رکھا اور کئی برس یہاں رہ کر ماہ عالم نے قرآن شریف اور مسئلہ مسائل کی کتابیں پڑھیں اور نماز روزے سے خوب واقف ہوگئے۔ تب شاہ صاحب نے اُن کی وہیں کسی نیک بخت سے شادی کردی اور اُنہوں نے اِسی جگہ رہنا اختیار کرلیا۔

☆☆☆☆☆

بنت بہادر شاہ

یہ ایک بیچاری درویشنی کی بچی بیتا ہے جو زمانہ کی گردش سے اُن پر گذری' اُن کا نام کلثوم زمانی بیگم تھا۔ یہ دہلی کے آخری مغل بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ ظفر کی لاڈلی بیٹی تھیں' چند سال ہوئے اُن کا انتقال ہوگیا۔ میں نے بارہا شہزادی صاحبہ سے خود اُن کی زبانی اُن کے حالات سنے ہیں کیونکہ اُن کو ہمارے حضور خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی خانقاہ سے خاص عقیدت تھی۔ اِس لئے اکثر حاضر ہوتی تھیں اور مجھ کو اُن کی دردناک باتیں سننے کا موقع ملتا تھا۔ نیچے جس قدر واقعات لکھے گئے ہیں وہ یا تو خود اُن کے بیان کردہ ہیں یا اُن کی صاحبزادی زینت زمانی بیگم کے' جواب تک زندہ ہیں اور پنڈت کے کوچہ میں رہتی ہیں اور وہ حالات یہ ہیں:۔

جس وقت میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لٹنے کا وقت قریب آیا تو دلی کے لال قلعہ میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ در و دیوار پر حسرت برستی تھی' اُجلے اُجلے سنگ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ تین دن سے کسی نے کچھ نہ کھایا تھا۔ زینت میری گود میں ڈیڑھ برس کی بچی تھی اور دودھ کیلئے بلکتی تھی۔ فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا نہ کسی انا کے۔ ہم سب اِسی یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ ظلِ سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔ آدھی رات کا وقت' سناٹے کا عالم' گولوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے لیکن حکم سلطانی ملتے ہی حاضری کیلئے روانہ ہوگئے۔ حضور مصلّے پر تشریف رکھتے تھے' تسبیح ہاتھ میں تھی۔ جب میں سامنے پہنچی' جھک کر تین مجرے بجالائی۔ حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے: کلثوم! لو اب تم کو خدا کو سونپا۔ قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے۔ تم اپنے خاوند کو لے کر فوراً کہیں چلی جاؤ' میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اِس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں۔ پر کیا کروں' ساتھ رکھنے میں تمہاری بربادی کا اندیشہ ہے۔ الگ رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کردے۔

اتنا فرما کر حضور نے دستِ مبارک دعا کیلئے بلند کیے جو رعشہ کے سبب کانپ رہے تھے' دیر تک آواز سے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے رہے۔

"خداوند! یہ بے وارث بچے تیرے حوالے کرتا ہوں۔ یہ محلوں کے رہنے والے جنگل ویرانوں میں جاتے ہیں۔ دُنیا میں اِن کا کوئی یار و مددگار نہیں رہا۔ تیمور کے نام کی عزت رکھیو اور اِن بیکس عورتوں کی آبرو بچائیو۔ پروردگار! یہی نہیں بلکہ ہندوستان کے سب ہندو مسلمان میری اولاد ہیں اور آج کل سب پر مصیبت چھائی ہے۔ میرے اعمال کی شامت سے اُن کو رسوا نہ کر اور سب کو پریشانیوں سے نجات دے"

اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا' زینت کو پیار کیا اور میرے خاوند مرزا ضیاء الدین کو کچھ جواہرات عنایت کر کے نور محل صاحبہ کو ہمراہ کر دیا جو حضور کی بیگم تھیں۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعہ سے نکلا جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک میرے خاوند مرزا ضیاء الدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ عورتوں میں ایک میں' دوسری نواب نور محل' تیسری حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں۔ جس وقت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے' صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے سب چھپ گئے تھے مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہم نے اپنے بھرے پرے گھر پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو اُمنڈ نے لگے۔ نواب نور محل کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں اُن کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں اور صبح کے ستارے کا جھلملانا نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر لال قلعہ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو کر کورالی گاؤں پہنچے اور وہاں اپنے رتھ بان کے مکان پر قیام کیا۔ باجرے کی روٹی اور چھاچھ کھانے کو میسر آئی۔ اُس وقت بھوک میں یہ چیزیں بریانی متنجن سے زیادہ مزیدار معلوم ہوئیں۔ ایک دن رات تو امن سے بسر ہوا مگر دوسرے دن گرد و نواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر کورالی کو لوٹنے چڑھ آئے۔ سینکڑوں عورتیں بھی اُن کے ساتھ تھیں جو چڑیوں کی طرح ہم لوگوں کو چمٹ گئیں۔ تمام زیور اور کپڑے اُن لوگوں نے اُتار لئے۔ جس وقت یہ سڑی بسی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے ہاتھوں سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں تو اُن کے لہنگوں کی ایسی بُو آتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔

اِس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت کی روٹی کو کافی ہو سکتا۔ حیران تھے کہ دیکھئے اب اور کیا پیش آئے گا۔ زینت پیاس کے مارے رو رہی تھی۔ سامنے

سے ایک زمیندار آ نکلا۔ میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی۔ بھائی! تھوڑا پانی اس بچی کو لا دے۔ زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا آج سے تو میری بہن اور میں تیرا بھائی۔ یہ زمیندار کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اُس کا نام بستی تھا۔ اُس نے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے ہم کو اس میں سوار کیا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہنچا دوں۔ ہم نے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی شاہی حکیم رہتے ہیں جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں' وہاں لے چل۔ بستی ہم کو اجاڑہ لے گیا مگر میر فیض علی نے ایسی بے مروتی کا برتاؤ کیا جس کی کوئی حد نہیں۔ صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لیے کہ میں تم لوگوں کو ٹھہرا کر اپنا گھر بار تباہ کرنا نہیں چاہتا۔

وہ وقت بڑا مایوسی کا تھا۔ ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہو گی' اس پر بے سروسامانی کا یہ عالم کہ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں' فوراً پورا کیا جائے' وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے۔ شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اُس نے زبانی بہن کہنے کو آخر تک نباہا اور ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ لاچار اجاڑہ سے روانہ ہو کر حیدر آباد کا رُخ کیا۔ عورتیں بستی کی گاڑی میں سوار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے۔ تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے جہاں کول کے نواب کی فوج پڑی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے جو سنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر کی اور ہاتھی پر سوار کر کے ندی سے پار اُتارا۔ ابھی ہم ندی کے پار اترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آ گئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور میرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہو کر لڑیں مگر رسلدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لے کر جلدی چلے جائیں' ہم جیسا موقع ہو گا' بھگت لیں گے۔ سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی۔ ہم لوگ اُس کے اندر چھپ گئے۔ ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگے۔ جو کچھ بھی ہوا' ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اُٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا۔ ہم لوگ وہاں سے نکل بھاگے۔ پر ہائے! مصیبت تھی کہ ہم کو بھاگنا بھی نہ آتا تھا۔ گھاس میں اُلجھ اُلجھ کر گرتے تھے۔ سر کی چادریں وہیں رہ گئیں۔ برہنہ سر حواس باختہ ہزار وقت سے کھیت سے باہر آئے۔ میرے اور نواب نور محل کے پاؤں خونم خون ہو گئے۔ پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں۔ زینت پر غشی کا عالم تھا۔ مرد ہم کو سنبھالتے تھے مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کمیٹ سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ میں زینت کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں' کہیں سہارا نظر نہیں آتا۔ قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہوگئی لیکن فقیروں کو چین واطمینان نصیب ہوتا ہے' یہاں وہ بھی نصیب نہیں۔

فوج لڑتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔ بستی ندی سے پانی لایا۔ ہم نے پیا اور نواب نور محل کے چہرے پر چھڑکا۔ نور محل رونے لگیں اور بولیں ابھی خواب میں تمہارے بابا حضرت ظل سجانی کو دیکھا ہے کہ طوق وزنجیر پہنے ہوئے کھڑے تھے اور کہتے ہیں کہ:

" آج ہم غریبوں کیلئے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا فرش مخمل سے بڑھ کر ہے۔ نور محل گھبرانا نہیں ہمت سے کام لینا۔ تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں۔ ذرا میری کلثوم کو دکھادو' جیل خانے جانے سے پہلے اس کو دیکھوں گا"

بادشاہ کی یہ باتیں سن کر میں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ کھل گئی۔ کلثوم کیا سچ مچ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا ہوگا' کیا واقعی وہ قیدیوں کی طرح جیل خانے بھیجے گئے ہوں گے۔ مرزا عمر سلطان نے جواب دیا کہ خواب وخیال ہے۔ بادشاہ لوگ بادشاہوں کے ساتھ ایسی بدسلوکیاں نہیں کیا کرتے' تم گھبراؤ نہیں' وہ اچھے حال میں ہوں گے۔ حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن بولیں' یہ موئے فرنگی بادشاہوں کی قدر کیا خاک جانیں گے۔ خود اپنے بادشاہ کا سر کاٹ کر سولہ آنے کو بیچتے ہیں۔ بوا نور محل تم نے تو طوق اور زنجیر پہنے دیکھا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ بنئے بقالوں سے تو اس سے زیادہ بدسلوکی دور نہیں ہے۔ مگر میرے شوہر مرزا ضیاء الدین نے تسکین دلاسے کی باتیں کر کے سب کو مطمئن کر دیا۔ اتنے میں بستی ناؤ میں گاڑی کو اس پار لے آیا اور ہم سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر شام ہوگئی اور ہماری گاڑی ایک بستی میں جا کر ٹھہری جس میں مسلمان راجپوتوں کی آبادی تھی۔ گاؤں کے نمبردار نے ایک چھپر ہمارے واسطے خالی کر دیا جس میں سوکھی گھاس اور پھوس کا بچھونا تھا۔ وہ لوگ اسی گھاس پر جس کو پیال یا پرال کہتے تھے' سوتے ہیں۔ ہم کو بھی بڑی خاطر داری سے (جوان کے خیال میں بڑی خاطر تھی) یہ نرم بچھونا دیا گیا۔

میرا تو اس کوڑے سے جی الجھنے لگا۔ پر کیا کرتے' اس وقت سوائے اس کے کیا ہوسکتا تھا۔ ناچار اسی میں پڑے رہے۔ دن بھر کی تکلیف اور تکان کے بعد اطمینان اور بے فکری میسر آئی

تھی' نیند آگئی۔ آدھی رات کو ایکا ایکی ہم سب کی آنکھ کھل گئی۔ گھاس کے تنکے سوئیوں کی طرح بدن میں چبھ رہے تھے اور پسو جگہ جگہ کاٹ رہے تھے۔ اس وقت کی بے کلی بھی خدا کی پناہ' پسوؤں نے تمام بدن میں آگ لگا دی تھی۔ مخملی تکیوں' ریشمی نرم نرم بچھونوں کی عادت تھی' اس لئے تکلیف ہوئی ورنہ ہم ہی جیسے وہ گاؤں کے آدمی بھی تھے جو بے غل وغش اسی گھاس پر پڑے سوتے تھے۔ اندھیری رات میں چاروں طرف گیدڑوں کی آوازیں آرہی تھیں اور میرا دل سہا جاتا تھا۔ قسمت کو پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن شہنشاہ ہند کے بال بچے یوں خاک پر بسیرے لیتے پھریں گے۔ قصہ مختصر اسی طرح منزل بہ منزل تقدیر کی گردشوں کا تماشا دیکھتے ہوئے حیدرآباد پہنچے اور سیتارام پیٹھ میں ایک مکان کرائے کو لے کر ٹھہرے۔ جیل پور میں میرے شوہر نے ایک جڑاؤ انگوٹھی جو لوٹ کھسوٹ سے بچ گئی تھی' فروخت کی' اسی میں راستہ کا خرچہ چلا اور چند روز یہاں بسر ہوئے۔ آخر تابہ کے' جو کچھ تھا' ختم ہوگیا۔ اب فکر ہوئی کہ پیٹ بھرنے کا کیا حیلہ کیا جائے۔ میرے شوہر اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے۔ انہوں نے درود شریف خط ریحان میں لکھا اور چار مینار پر ہدیہ کرنے کیلئے گئے۔ اس کے بعد یہ قاعدہ ہوا کہ جو کچھ لکھتے' کتی بڑھتی' فوراً بک جاتا۔ اس طرح ہماری گزر اوقات عمدگی سے ہونے لگی۔ لیکن موسیٰ ندی کے چڑھاؤ سے ڈر کر شہر میں داروغہ احمد کے مکان میں اٹھ آئے۔ یہ شخص حضور نظام کا خاص غلام تھا۔ اس کے بہت سے مکان کرایہ پر چلتے تھے۔

چند روز بعد خبر اڑی کہ نواب لشکر جنگ جس نے شہزادوں کو اپنے پاس پناہ دی تھی' انگریزوں کے زیر عتاب آ گیا ہے اور اب کوئی شخص دہلی کے شہزادوں کو پناہ نہیں دے گا بلکہ جس کسی کو شہزادے کی خبر ملے گی' اس کو گرفتار کرانے کی کوشش کرے گا۔ ہم سب اس خبر سے گھبرا گئے اور میں نے اپنے شوہر کو باہر نکلنے سے روک دیا کہ کہیں کوئی دشمن پکڑوا نہ دے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے فاقوں کی نوبت آگئی تو ناچار ایک نواب کے لڑکے کو قرآن پاک پڑھانے کی نوکری میرے شوہر نے بارہ روپیہ ماہوار پر کرلی۔ چپ چاپ اس کے گھر چلے جاتے اور پڑھا کر آ جاتے مگر وہ نواب اس قدر بد مزاج تھا کہ ہمیشہ معمولی نوکروں کی طرح میرے شوہر کے ساتھ برتاؤ کیا کرتا تھا جس کی برداشت وہ نہ کر سکتے تھے اور گھر میں آکر رو رو کر دعا مانگتے کہ الٰہی! اس ذلت کی نوکری سے تو موت لاکھ درجے بڑھ کر ہے۔ تو نے احتیاج بنا دیا۔ کل تو اس نواب جیسے سینکڑوں ہمارے غلام تھے اور آج ہم اس کے غلام ہیں۔ اسی اثناء میں کسی نے میاں نظام الدین کو ہماری خبر

کردی۔ میاں کی حیدر آباد میں بڑی عزت تھی کیونکہ میاں حضرت کالے میاں چشتی نظامی فخری کے صاحبزادے تھے جن کو بادشاہ دہلی اور نظام اپنا پیر تصور کرتے تھے۔ میاں رات کے وقت میانہ میں سوار ہو کر ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم کو دیکھ کر بہت روئے۔ ایک زمانہ تھا کہ جب وہ قلعہ میں تشریف لاتے تو مسند زرنگار پر بٹھائے جاتے تھے۔ بادشاہ بیگم اپنے ہاتھوں سے لونڈیوں کی طرح مگس رانی کرتی تھی۔ آج وہ گھر میں آئے تو ثابت بوریا بھی نہ تھا جس پر وہ آرام سے بیٹھ جاتے۔ پچھلا زمانہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ خدا کی شان کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میاں بہت دیر تک حالات دریافت کرتے رہے۔ اس کے بعد تشریف لے گئے۔ صبح کو پیام آیا کہ ہم نے خرچ کا انتظام کروا دیا ہے۔ اب تم حج کا ارادہ کر لو۔ یہ سُن کر جی باغ باغ ہو گیا اور مکہ مکرمہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ القصہ حیدر آباد سے روانہ ہو کر بمبئی آئے اور یہاں اپنے سچے رفیق بستی کو خرچ دے کر اُسکے گھر رخصت کر دیا۔ جہاز میں سوار ہوئے۔ جو مسافر یہ سنتا تھا کہ شاہ ہند کے گھرانے کے ہیں تو ہمارے دیکھنے کا شوق ظاہر کرتا تھا۔ اُس وقت ہم سب درویشانہ لباس میں تھے۔ ایک ہندو نے جس کی شاید عدن میں دکان تھی اور جو ہمارے حال سے بے خبر تھا' پوچھا کہ تم لوگ کس پنتھ کے فقیر ہو۔ اُس کے سوال نے زخمی دل کو چھیڑ دیا' بولی:

"ہم مظلوم شاہ گرو کے چیلے ہیں۔ وہی ہمارا باپ تھا وہی ہمارا گرو۔ پاپی لوگوں نے اس کا گھر بار چھین لیا اور ہم کو اُس سے جدا کر کے جنگلوں میں نکال دیا۔ اب وہ ہماری صورت کو ترستا ہے اور ہم اُس کے درشنوں کے بغیر بے چین ہیں"

اس سے زیادہ اور کیا اپنی فقیری کی حالت بیان کریں۔ جب اُس نے ہماری اصلی کیفیت لوگوں سے سنی تو بیچارہ رونے لگا اور بولا: بہادر شاہ ہم سب کا باپ اور گرو تھا۔ کیا کریں رام جی کی یہی مرضی تھی کہ وہ بے گناہ برباد ہو گیا۔

مکہ پہنچے تو اللہ میاں نے ٹھہرانے کا ایک عجیب ٹھکانہ پیدا کر دیا۔ عبدالقادر نامی میرا ایک غلام تھا جس کو میں نے آزاد کر کے مکہ بھیج دیا تھا۔ یہاں آ کر اُس نے بڑی دولت کمائی زمزم کا داروغہ ہو گیا۔ اُس کو جو ہمارے آنے کی خبر ملی' دوڑا ہوا آیا اور قدموں پر گر کر خوب رویا۔ اُس کا مکان بہت اچھا اور آرام کا تھا۔ ہم سب وہیں ٹھہرے۔ چند روز کے بعد سلطان روم کے نائب کو جو مکہ میں رہتا ہے' ہماری خبر ہوئی تو وہ بھی ہم سے ملنے آیا۔ کسی نے اُس سے کہا کہ شاہ دہلی کی لڑکی آئی ہے جو بے خوابانہ باتیں کرتی ہے۔ نائب سلطان نے عبدالقادر کے ذریعہ سے ملاقات کا پیام

دیا جو میں نے منظور کیا۔ دوسرے دن وہ ہمارے گھر پر آیا اور نہایت ادب قاعدہ سے بات چیت کی۔ آخر میں اُس نے خواہش کی کہ میں آپ کے آنے کی اطلاع حضور سلطان کو دینی چاہتا ہوں۔ میں نے اِس کا جواب بہت بے پروائی سے دیا کہ اب ہم ایک بڑے سلطان کے دربار میں آ گئے ہیں۔ اب ہمیں کسی دوسرے سلطان کی پروا نہیں ہے۔ نائب نے ایک معقول رقم ہمارے اخراجات کیلئے مقرر کر دی اور ہم نو برس وہاں مقیم رہے۔ اِس کے بعد ایک سال بغداد شریف' ایک سال نجف اشرف و کربلائے معلٰی میں بسر ہوا۔ اتنی مدت کے بعد دہلی کی یاد نے بے چین کیا اور روانہ ہو کر دہلی آ گئے۔ یہاں انگریزوں کی سرکار نے بہت بڑا ترس کھا کر دس روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ اِس پنشن کی رقم کا سن کر اول تو مجھے ہنسی آئی کہ میرے باپ کا اتنا بڑا ملک لے کر دس روپیہ معاوضہ دیتے ہیں مگر پھر خیال آیا کہ ملک تو خدا کا ہے' کسی کے باوا کا نہیں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ انسان کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

نواب مسعود جنگ بہادر کا شکریہ

آخر میں اپنے دوست اور قوم وملک کے محسن جناب سید راس مسعود صاحب الخاطب بہ نواب مسعود جنگ بہادر کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جن کی خواہش سے اس کتاب کا یہ خاص ایڈیشن تیار ہوا ورنہ اب تک یہ کتاب اور اِس کے بعد کے گیارہ حصے معمولی طریقے سے شائع ہوا کرتے تھے۔

آنریبل مولانا سر سید احمد خان بہادر رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور جانشین کی اپنی قوم کی تاریخ اور اپنی زبان اُردو کی ترقی سے دلچسپی ایک ورثہ ہے جو اُن کو باپ دادا سے ملا ہے۔ اِن کے والد جناب سید محمود صاحب نے اور اِن کے دادا سر سید نے جو کچھ تاریخ ولٹریچر کی خدمت کی ہے اُس سے ہر ہندوستانی واقف ہے اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جو خدمت سید راس مسعود کر رہے ہیں وہ بھی اِن کے باپ دادا کا ترکہ اور ورثہ ہے۔

فرقہ بندی اور قبیلہ پرستی کوئی اچھی چیز ہوتی اور میں اس کا مخالف نہ ہوتا تو کہتا کہ سادات بنی فاطمہ نے ہمیشہ ملک وقوم کی ایسی ہی خدمتیں کی ہیں اور سید راس مسعود کا یہ ذوق اور علمی وتاریخی ولٹریری ولولہ جو اس کتاب کی اشاعت کے ذریعہ ظاہر ہوا اُن کا جدی اور قدیمی جذبہ ہے۔

میں اس ایڈیشن کو خاص ایڈیشن اِس لحاظ سے نہیں کہہ سکتا کہ اِس کی طباعت وجلد بندی میں کوئی ایسا نمایاں اہتمام نہیں ہے جو اعلیٰ ایڈیشنوں میں ہوا کرتا ہے کیونکہ ایسا اہتمام اِس ایڈیشن میں نہیں ہے۔ اِس ایڈیشن کو تو خاص ایڈیشن محض اِس وجہ سے کہنا چاہیے کہ اِس میں ایک مشہور اور مقبول اور مؤثر کتاب کا اقتباس ہے اور اِس کو ذرا اچھے کاغذ پر چھاپ دیا گیا ہے اور اِس کی جلد بھی بندھوادی ہے۔

ہر ایک کے آنسو

اِس کتاب کا نام "بیگمات کے آنسو" شہزادیوں کی دردناک حقیقت مرقوم ہونے کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ پہلے اِس کا نام محض "آنسو کی بوندیں" تھا اور اِس نام کی وجہ بھی کتاب

کے واقعات ہی تھے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے ہر ایک ناظر کے آنسو آجاتے ہیں لہٰذا اِس کو ہر ایک کے آنسو کہنا چاہیے۔

واعظ جب اپنی تقریر میں اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو خود رونے لگتے ہیں یا کربلا کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ میں نے اِس کتاب میں نہ بناوٹی آنسو بہائے نہ کربلا کا ذکر کیا لیکن دہلی کے شاہی خاندان کی داستان ہی ایسی دردانگیز ہے کہ جو سنتا ہے رونے لگتا ہے۔

مسلمان قوم کی حکومتوں میں ہر جگہ انقلاب آئے اور انقلاب سے جو تباہی آتی ہے وہ بیسیوں جگہ پیش آئی مگر دہلی کا انقلاب ایک ایسا انقلاب تھا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں اور مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

ایک پوری قوم پر زوال آگیا اور ایک بڑی دبدبے والی قوم کے عزت والے نیست ونابود ہو گئے اور اِس قوم کے شاہی افراد پر تو ایسی آفت آئی کہ ہر گھر میں اور ہر خاندان میں اسپین کے غرناطہ وغیرہ کا حسرت ناک ڈرامہ نظر آئے گا۔

دنیا خیال کرے گی کہ یہ میرے لکھنے کی خوبی ہے۔ نہیں نہیں اُس کتاب کا اثر اِن واقعات وحالات کی وجہ سے ہے جو اِس کتاب میں مذکور ہیں۔ میرا کام تو واقعہ کو مؤثر دوں اور عام فہم الفاظ میں بیان کر دینا تھا سو بیان کر دیا۔ اِس کتاب میں بعض واقعات کو ایسے طریقے سے بیان کیا گیا ہے جو اصلیت کے خلاف ہے۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ مصیبت میرے بیان سے زیادہ تھی اور زیادہ ہے۔ سر سید نے "اسباب بغاوت ہند" کتاب ایک اور مقصد سے لکھی تھی جس میں اُن کو کامیابی ہوئی یعنی انگریز حکومت کو غدر 1857ء کے وہ اسباب معلوم ہوئے جن کو اُس وقت کے افسر غم وغصہ کی حالت میں بھولنا چاہتے تھے اور سر سید نے اُن کو یاد دلا کر غصہ کو کم کر دیا اور برٹش حکومت اصلی اسباب پر غور کرنے لگی اور ایک معتوب قوم پر جو عتاب کی نظر ہو رہی تھی اس میں کمی آگئی۔

میری یہ کتاب تو ایک انقلاب کی دردناک تاریخ ہے ایک بڑی مصیبت کا مرثیہ ہے اور اُردو نثر میں ایک سادہ اور عام فہم نوحہ ہے۔

مسلمانوں کی ہندوستانی تاریخ میں رونے اور غمگین ہو جانے کے بکثرت حالات موجود ہیں ورن میں دہلی کے انقلاب کی داستان بھی ہے۔ مجھ پر جس چیز کا زیادہ اثر ہوا وہی چیز قلم کی زبان پر آگئی۔

جو مر گئے تھے یا جان کنی میں تھے یا اُن کی زندگی مُردوں سے بدتر ہو گئی تھی اُن کے حالات اس کتاب میں لکھ کر میں نے اپنی تحریر کو زندہ کر دیا۔ خدا کی شان ہے کہ ایک قوم تباہ ہوتی ہے اور ایک حکومت کے گھر کا چراغ گل ہوتا ہے اور ایک شخص اس ماجرے کو بیان کر کے اُردو لٹریچر کے گھر میں روشنی کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے خلقت اس کی تحریر کو پسند کرنے لگتی ہے۔

کتاب کے آخر کی یہ عبارت یقیناً میرا بس ایک آخری آنسو ہے۔ آخری اس واسطے کہ جب کبھی میں کوئی قصہ انقلاب دہلی کا لکھتا ہوں تو بار بار پڑھتا ہوں اور روتا ہوں اور اب چونکہ یہ کتاب ختم ہو رہی ہے تو میں پھر رویا اور آخری آنسو ٹپکا کر یہ تحریر ختم کر دی۔

خواجہ حسن نظامی

دسمبر 1930ء دہلی

تمت بالخیر